

یہ خاموشی کہاں تک؟

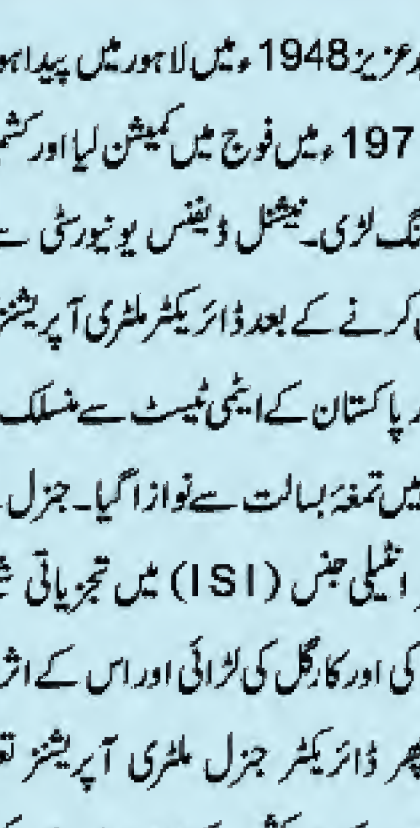
ایک سپاہی کی داستانِ عشق و جنوں

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) شاہد عزیز



مشرف نے کارگل جنگ پر رپورٹ مرتب کرنے سے روک دینا

کارگل آپریشن کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ جی ایچ کیو میں بھی جائزہ نہیں لیا گیا۔ منصوبے کا علم صرف چار جنرلز کو تھا۔ یہ کہنا کہ بھارت کا حملہ ہماری پہل سے رک گیا اصل حقائق سے پردہ پوشی ہے۔ اس محاذ میں مجاہدین کا بھی کوئی حصہ نہیں تھا۔ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے اقتباسات



جنرل شاہد عزیز 1948ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپریل 1971ء میں فوج میں کمیشن لیا اور کشمیر کے محاذ پر جنگ لڑی۔ نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی سے فوجی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز متعین ہوئے اور پاکستان کے ایٹمی ٹیسٹ سے منسلک رہے، جس پر انہیں تنفہ بہانت سے نوازا گیا۔ جنرل بننے پر انٹر سروسز انٹیلی جنس (ISI) میں تجرباتی شعبے کی سربراہی کی اور کارگل کی لڑائی اور اس کے اثرات کو دیکھا۔ پھر ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز تعینات ہوئے۔ اس کے بعد کشمیر کے محاذ پر ڈویژن کی کمان کی۔ 11/9 کے بعد لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر چیف آف جنرل اسٹاف کا منصب سنبھالا اور اس خطے میں امریکہ کے مکمل کو قریب سے دیکھا۔ فوج کے آخری دو سال لاہور کے کور کمانڈر کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ 2005ء میں ریٹائر ہوئے اور فوجی سروس میں کارکردگی کی بنیاد پر ہلال امتیاز ملا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد نیب کے سربراہ کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا، پھر اصولی بنیاد پر استعفیٰ دیدیا۔

”سر یہ کچھ عجیب سے انڈیا کے مواصلاتی انٹرسیپٹ (Wireless intercepts) آرہے ہیں“، میں نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات ڈی جی آئی ایس آئی کی طرف بڑھائے۔ بہت پریشان سی، بولھٹائی ہوئی باتیں تھیں، جھگڑ رہے تھے، ”انڈیا کے فوجی بہت گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں“ میں نے کہا۔ ”گتا ہے ہماری فوج نے کارگل کے علاقے میں کوئی بڑی کارروائی کی ہے“۔ انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ کاغذات اپنے پاس ہی رکھوں اور کہا بیٹھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل ضیا الدین، جنہوں نے جنرل رانا کے بعد ISI کو سنبھالا، نہایت بااخلاق اور مہذب انسان تھے، ہر ایک کی عزت کرتے، جب دفتر میں جاتا کھڑے ہو کر ملتے، ہمیشہ مسکرا کر بات کرتے۔ ایک دن پہلے بھی کچھ مشترکہ سے انٹرسیپٹس آئے تھے تو میں نے کہا اس علاقے پر فوکس رکھیں، سوچا دیکھوں، کیا یہ کوئی مشق ہو رہی ہے یا معاملہ کچھ اور ہے۔ مگر آج کے انٹرسیپٹس سے تو لگتا تھا 10 کورے کوئی جارحانہ کارروائی کی ہے۔ میں بیٹھ گیا تو انہوں نے بتایا کہ ہماری فوج کارگل کے خاصے بڑے خالی علاقوں پر قبضہ کر چکی ہے۔ شاید 3 یا 4 مئی 99ء کا دن تھا۔

دوسرے دن ایم او میں ہمیں بریفنگ کیلئے بلا لیا گیا۔ CGS، لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان، سمیت تمام GHQ کے لیفٹیننٹ جنرل بھی موجود تھے۔ بریفنگ میجر جنرل توقیر ضیا، DGMO نے دی، جس میں بتایا گیا کہ ہماری فوج کی ناردرن لائن انفنٹری (NLI) اور ریگولر فوج کی یونٹوں نے کارگل کے علاقے میں وہ پہاڑی چوٹیاں قبضے میں کر لی ہیں جو خالی پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ پرتو ہندوستان کی فوجی گریو میں رہتی تھی اور سردیوں میں چھوڑ جاتی تھی، باقی ویسے ہی خالی پڑی تھی۔ اب ان جگہوں سے ہماری فوج کافی آگے تک جا چکی ہے اور اس کارگل روڈ پر ہمارے چھوٹے ہتھیاروں کا فائر گرتا ہے۔ راستہ بند ہو چکا ہے۔ اب سیانجینسکری سہلائی لائن کٹ چکی ہے اور سردیوں کیلئے ڈیمپنگ (ذخیرہ اندوزی) مکمل نہیں ہو سکے گی۔ انہیں سیانجین چھوڑنا پڑے گا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ تجزیہ MO کا نہیں، جوائنٹ اسٹاف ہیڈ کوارٹر (JS HQ) کا تھا۔ اگلے دن کارگل کی خبر اخباروں میں آگئی۔

جنرل مشرف صاحب نے اپنی کتاب میں جو کارگل کی تاریخ رقم کی ہے، اس میں چند باتوں کی درستی کرنا چاہوں گا۔ یہ ہماری تاریخ ہے اور اس قوم کے نوجوانوں کے خون سے لکھی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر حقیقت نہ بیان کی گئی تو ان کا لہورائیگاں جائے گا۔ ہم نے 1971ء کی جنگ کی بھی حقیقتیں چھپا کر رکھیں اور آج پھر اسی راہ پر چل رہے ہیں۔ جب سچ پر پردہ ڈال دیا جائے تو اس سے کیا سبق کوئی سمجھے؟ جب سب ٹھیک تھا، کوئی غلطی نہیں ہوئی تو یقیناً آئندہ بھی ویسے ہی کیا جائے گا۔ پھر تاریخ کے کڑوے لمحے پلٹ کر آئیں گے، ہمارا خون بہائیں گے اور ہمارے حکمران ایسے ہی جھوٹ بولیں گے، جسے آج ہم سیاسی مصلحت کہنے لگے ہیں، جھوٹ نہیں۔ اب نہ تو اس کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے اور نہ ہی حوصلہ۔

جن دنوں میں چیف آف جنرل اسٹاف (CGS) کے عہدے پر فائز تھا، 2002ء میں، میں نے کارگل کی جنگ کے بارے میں ایک مطالعاتی ریسرچ شروع کروائی، تاکہ فوج کی کمزوریاں سامنے آسکیں اور ہم اپنی لڑائی کی صلاحیت میں بہتری لاسکیں۔ صدر صاحب کی اس جنگ کے بارے میں حساس طبیعت اور اس وقت کے ماحول پر سچ کے سیاسی اثرات کو دیکھتے ہوئے، میں نے اس اسٹڈی کو بٹالین کی سطح تک محدود رکھا۔ ہدف صرف یہ تھا کہ نیچلے درجے پر، یعنی بٹالین اور اس سے نیچے کی سطح پر، جو کارروائیاں ہوئی ہیں، ان سے آئندہ کیلئے اسباق حاصل کیے جاسکیں۔ تمام حصہ لینے والی یونٹوں سے ان کی روداد اور تیسرے منگوائے اور اسٹڈی شروع کروادی۔ پھر مشرف صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے مجھ سے بہت ناراضگی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ میں نے انہیں اسٹڈی کا مقصد بتایا تو کافی خفگی سے اسٹڈی فوری طور پر بند کروادی۔ ISI میں اس قسم کی نہ ہی کوئی اسٹڈی کروائی گئی اور نہ ہی ہو سکتی تھی، کیونکہ اس کیلئے تمام 10 کور کی یونٹوں سے تفصیلات چاہئے تھیں، جو کارگل کے بعد کے دنوں جیسے ماحول میں ISI کو نہیں مل سکتی تھیں۔

ISI میں آنے سے پہلے میں دو سال MO میں رہ کر آیا تھا۔ وہاں کی چیزیں مجھے سے چھپی نہیں تھیں۔ جب MO میں بریفنگ کیلئے پہنچا تو پتا چلا کہ سوائے جنرل مشرف، لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز خان CGS جو کمانڈر فورس کمانڈر ناردرن ایریا (FCNA) گلگت بھی رہ چکے تھے، لیفٹیننٹ جنرل محمود (کمانڈر 10 کور) اور میجر جنرل جاوید حسن (کمانڈر FCNA) کے کسی اور سینئر افسر کو اس کارروائی کا قانون کا علم نہ تھا۔ حتیٰ کہ ہیڈ کوارٹر 10 کور کے اسٹاف بھی شروع میں اس سے نا آشنا تھے، جبکہ MO ڈائریکٹر یٹ کو بھی بہت بعد میں پتا چلا، جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ یہ کہنا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس کارروائی کا باقاعدہ GHQ میں جائزہ لیا گیا، سچائی سے بہت دور ہے۔ یہ باتیں پھر مختلف جگہوں سے بھی میرے علم میں آتی رہیں۔ MO اتنا نا کارہ ادارہ نہیں کہ تجزیوں کے ایسے نتائج نکالے۔

جب لڑائی کے اثرات کھل کر سامنے آئے تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آری ہیڈ کوارٹر میں، صرف CGS کو بتا دینا کافی تھا؟ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بتانے سے بات بھیجی نہ رہتی۔ آخر اعتماد کوئی تو دائرہ اعلیٰ قیادت کی سطح پر ہوگا۔ اس کے بغیر تو فوج جنگ نہیں لاسکتی۔ یہ کہنا کہ صرف چھوٹا سا کوریج سطح پر آپریشن تھا، کوئی بڑی کارروائی تو تھی نہیں کہ کسی کو بتاتے، غلط بات ہے۔

دنیا میں ہتھکڑی لگا لیا۔ کیا یہ کوئی چھوٹی بات تھی؟ ”اطلاعات ضرورت کے تحت (need to know basis) دی گئیں“ ایک ایسا جملہ ہے جس کے پیچھے کارروائیوں کو چھپانے والا اوٹ لیتا ہے۔ آج ہر کوئی جانتا ہے کہ کس کس کو خبر ہونی چاہئے تھی اور نہ تھی۔ یہی جملہ 11/9 کے بعد بھی بار بار استعمال ہوتا رہا مختلف پوشیدہ کارروائیوں کے انکشاف پر اور آج بھی استعمال ہو رہا ہے۔

خفیہ رکھنے کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ یہ منصوبہ فوجی فکٹ نظر سے اس قدر کمزور تھا اور اس کی تیاری اتنی محدود، پھر حالات کی مناسبت سے اس کا وقت اتنا مناسب تھا کہ کوئی بھی اس کے حق میں نہ ہوتا۔ شاید اس وجہ سے کسی کو بتایا نہیں۔ پھر سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیا ہی کیوں؟ کیا اس کے کوئی اور مقاصد بھی تھے یا صرف ایک غلطی ہی تھی؟ شاید یہ راز کبھی کھلے۔

فوج میں جب بھی کوئی منصوبہ بنایا جاتا ہے، ہر قسم کی مشکلات اور دشمن کے ہر رد عمل کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہاں تو لگتا تھا کہ کوئی رد عمل متوقع ہی نہ تھا۔ بس فرض (assume) کر لیا گیا تھا کہ دشمن ہم کو بیٹھا رہے گا، ان پوسٹوں کو واپس نہ لے سکے گا اور مصالحت کی میز (negotiating table) پر آجائے گا۔ وہ وہ جو آپ کا آدھا مکلا کھا گیا، ڈکار بھی نہ لی۔ یہ کہاں تک درست ہوگا کہ اپنی صفائی میں کہہ دیا جائے کہ دشمن نے اور وری ایکٹ (over react) کیا، ضرورت سے زیادہ بڑا جواب دیا، کبھی کو تو حضور سے سے مارا؟ یہی مطلب ہوا کہ ہمارا تجزیہ غلط نہیں تھا، اس کا رد عمل ہی غلط تھا، تو ہم ہمیشہ کی طرح ٹھیک تھے! تجزیہ تو رد عمل کا ہی کرنا تھا، تو کیا ٹھیک تھا؟ کن مفروضوں (assumptions) پر یہ منصوبہ بنا اور بعد میں جو صفا فیاں پیش کی جاتی ہیں، حیران کن ہیں۔

میں ISI میں ہندوستان کی تمام کارروائیوں پر نظر رکھنے پر معذور تھا۔ ان کی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہیں تھی جس سے یہ تجزیہ لگایا جائے کہ وہ کسی جارحانہ کارروائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ جو ان کی کچھ پوسٹوں سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ پاکستان کی فوج کا حملہ نہ آیا اور اسے مار بھگا یا گیا۔ چلی سطح پر کچھ انڈیا کے افسران کی تمنے لینے کی بھونڈی ترکیب تھی، جو بعد میں کھل گئی۔ ISI میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

ہمارے پاس اس قسم کی کارروائی کرنے کا کسی قسم کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شملہ معاہدے کے بعد سے، سوائے سیانجین، جہاں لائن آف کنٹرول (LOC) کی نشاندہی مکمل طور پر نہیں کی گئی تھی، کسی جگہ پر انڈیا نے یہ لائن پار نہیں کی۔ ایک آدھ مورچے کی سطح پر جھگڑا ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ اگر کسی معنی خیز پیمانے پر لائن پار کی ہوتی تو ہم نے اس پر کم از کم کوئی احتجاج تو یقیناً کیا ہوتا، دفتر خارجہ میں اس کا کوئی ریکارڈ (record) ہوتا۔ ایسا کچھ نہ تھا۔ ان کی طرف سے نہ ہی کسی حملے کی تیاری تھی اور نہ ہی کسی طرح سے کوئی ارادہ نظر آتا تھا۔ یہ کہنا کہ ہمارے سینئر کمانڈروں کی دور اندیشی اور چورس رہنے کی وجہ سے انڈیا کا حملہ ہماری پہل (preemption) سے نکل گیا حقیقت نہیں، محض اصلی حقائق کی پردہ پوشی ہے۔

یہ کہنا کہ LOC کے ساتھ خالی جگہوں پر قبضہ کرنا کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں تھی اور زمین پر موجود کمانڈر کے دائرہ کار میں آتا تھا، غلط تصویر پیش کرتا ہے۔ اگر یہ کسی معاہدے کی خلاف ورزی ہی نہیں تھی اور ہم جو کر رہے تھے ٹھیک تھا تو ہندوستان سمیت ساری دنیا ہم سے لڑنے پر کیوں اتر آئی اور ہم اتنے گھبرا کیوں گئے، جیسے کوئی بڑا گناہ کر دیا ہو؟ ہندوستان تو اُس معاہدے کی خلاف ورزی کا گناہ کر رہا ہے، جس میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے تین دریاؤں کا پانی انہیں بخش دیا، محض اپنے دوست امریکہ کو خوش کرنے کی خاطر اور اپنے آقا وارلڈ بینک کے چند سکوں کے عوض۔ آج وہ ہمارا پانی بند کر کے ہماری زمینوں کو خیر کر رہا ہے ہمیں سیلاب میں ڈبوئے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے، ہمارے دفاعی نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے، مگر ہم پھر بھی سوائے پُر خیر کرنے کے کچھ آگے نہیں بڑھتے۔ کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ ہم نے کوئی خلاف ورزی بھی نہیں کی، پھر بھی شامت آگئی؟ ہم LOC سے میلوں آگے گھس بیٹھے، پھر بھی کیا کوئی معاہدہ نہیں ٹوٹا؟ یہ علاقہ 1971ء کی لڑائی کے بعد شملہ معاہدے کے تحت انہوں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ اسے واپس لینے کا عجز کیا زمین پر موجود کمانڈر ہی تھا؟ کسی اور کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا یہ بجا توقع تھی کہ ہندوستان چپ کر کے بیٹھا رہے گا؟

FCNA کا منصوبہ دفاعی نوعیت کا ہرگز نہیں تھا۔ یہ مکمل طور پر جارحانہ کارروائی تھی اور LOC کے پار کے علاقے پر بلا اشتعال قبضہ کرنے کا منصوبہ، تاکہ سیانجین کے مواصلاتی راستے (lines of communication) کو کاٹا جاسکے، جو بذاتہ خود ایک بہکا ہوا مفروضہ تھا۔ یہ کوئی معمولی نتیجہ نہیں تھا، جو ہم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کو چھوٹی tactical حرکت کہنا کیسے بجا ہو، جبکہ جنرل مشرف ہی کی کتاب میں یہ درج ہے کہ اس دشوار پہاڑی علاقے میں 800 مربع کلومیٹر علاقے پر ہم نے قبضہ کیا۔ کتابی طور پر تو ہماری اور ہندوستان کی ہر لڑائی tactical ہی کہلائے گی، مگر جب خود کہہ رہے ہیں کہ ”معنی خیز اسٹریٹجک اثرات“ (significant strategic effects) حاصل ہوئے تو پھر یہ دفاعی نوعیت کا چھوٹا سا آپریشن کیونکر ہو سکتا ہے کہ صرف زمین پر موجود کمانڈر کے ہی دائرہ کار میں آتا ہو اور یہ کہ 10 کور کے علاوہ کسی اور کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا یہ سوچا نہیں تھا کہ اس آپریشن کے اثرات اسٹریٹجک ہوں گے، بعد میں پتا چلا؟ کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے بعد تو اثرات سب کو نظر آتے ہیں۔ فوجی لیڈر کی دانائی اگر اس قدر محدود ہے کہ فیصلہ لینے سے پہلے اسے اپنے فیصلے کے اثرات کا علم ہی نہیں تو اسے فوج کی کمانڈ کا ہرگز حق نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری تاریخ میں ایسے کمانڈر فوج کو نصیب ہوئے۔

اس پوری لڑائی میں مجاہدین کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ جب پہلی مرتبہ MO میں بریفنگ (briefing) کے لیے گیا تو جنرل توقیر ضیا (DGMO) نے بتایا کہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ فوج اس کارروائی میں شامل نہیں، ٹیپ پر ریکارڈ کیے ہوئے بیٹوں میں پیغامات دائر لائن پر شروع دن سے چلائے جا رہے تھے، تاکہ یہ تصور قائم ہو کہ یہ سب کام مجاہدین ہی نے کیے ہیں۔ یہ سن کر میں بڑا حیران ہوا اور میں نے سوال کیا کہ کیا قائد، کیونکہ ہماری اتنی فوج دشمن کے علاقے میں گھس بیٹھی ہے، وہ ہم سے لڑیں گے، کچھ ہمارا سامان بھی ان کے قبضے میں آئے گا، کچھ قیدی بھی اور کچھ شہیدوں کے جسم بھی۔ کسی بھی جنگ میں اس طرح کی بات چھپائی نہیں جاسکتی۔ اس پر جنرل عزیز بھی ناراض ہوئے اور کچھ بحث ہوئی پھر DGMO نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مگر ہوا ایسے ہی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ISI کو کارگل میں فوج کی کارروائیوں کی خبر تھی، کیونکہ ان کے نمائندے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر فوج کی نقل و حرکت، تو پورے کونے علاقے میں لے جانا، اُن کا موٹیفن جگہ جگہ پہنچانا چھپ نہیں سکتا۔ صرف گاڑیوں ہی کی حرکت، بات سمجھنے کو کافی ہوگی۔ پھر FCNA میں ہزاروں لوگوں کو ان کارروائیوں کا علم تھا۔ آپ اوپر کے درجے پر جتنی بھی خاموشی رکھیں ISI کے کارندوں سے یہ سب چھپ نہیں سکتا۔ جس ماحول میں یہ سب ہوا، یقیناً نواز شریف صاحب، جو پرائم منسٹر تھے اور جنہیں ISI DG خبریں پہنچاتے تھے، اس کی تیاری سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اُن کو باقاعدہ طریقے سے بتایا گیا یا نہیں اور اگر بتایا بھی گیا تو کتنا بتایا اور کیا تاثر دیا۔ ان دنوں سننے میں جو باتیں آتی تھیں ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ بتایا گیا تھا۔ ایک صاحب نے تو یہ بھی کہا کہ بریفنگ کے بعد چائے کے دوران نواز شریف صاحب نے ان سے کہا، ”جنرل صاحب، پھر آپ ہمیں کشمیر کب دلوار ہے ہیں؟ واللہ عالم۔“ مجھے تو یقین نہیں کہ امریکہ کی اس کارروائی سے لاعلم تھا۔ (جاری ہے)



مشرف کس کو فوج کی لہانڈسوپے بغیر سرتیلا چلے گئے تھے

اگر کوئی جھگڑا کھڑا ہوتا تو ملک میں آفت آجاتی۔ جنرل ضیاء کو نیا آرمی چیف بنانے کی خبر سنتے ہی میں دفتر کی طرف بھاگا۔ 12 اکتوبر 1999ء کو میرے دفتر سے نکلے احکامات پر ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی۔ کیا علم تھا کہ قوم کی امیدوں کا خون ہوگا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

”سر، جلدی دی وی لگا میں، دیکھیں کیا آرہا ہے، جنرل ضیا کو نیا لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار آرمی چیف بنا دیا گیا ہے۔“ MO سے ایک کرنل صاحب کا فون آیا۔ اکتوبر کی بارہ تاریخ 1999ء کی شام، تقریباً پانچ بج رہے۔ باکر دار اور اصول پسند افسران میں ہوتا تھے، میں ابھی دفتر سے گھر پہنچا ہی تھا۔ گیسٹ روم سے نکل کر اپنے گھر میں آئے ہوئے ہمیں شاید دو یا تین روز ہوئے تھے، سامان بھی پورا نہیں کھلا تھا۔ سوٹ کیسوں کو پھلانگتا ہوا فوراً ہی واپس دفتر کی طرف بھاگا۔ جاتے ہوئے انجم سے کہا ”گیسٹ بند کرو اور ہاں، میرا لیپ ٹاپ (laptop computer) بھائی کے گھر بھجوا دو۔“ اس میں حکومت کا تختہ الٹنے کی ساری تفصیلات پر کام کیا تھا۔ نہ جانے آج کیا ہوگا۔ اگر ناکام رہا تو.....“ شاید آنے میں دیر ہو جائے..... کہیں نہ سکتا کتنی“۔ انجم ان تمام باتوں سے ناواقف تھی۔ میں نے کبھی اسے اپنے کام میں نہیں الجھایا۔ دفتر کے بیچ دفعتاً ہی رتی۔ مگر آج مجھے اس تیزی سے نکلنے دیکھ کر کچھ پریشان ہی ہوئی۔ گھبراہٹ تو وہ نہیں تھی، پھر اتنا عرصہ ساتھ رہ کر کچھ انجانے حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی ہو گیا تھا۔ کچھ پوچھ رہی تھی، لیکن میں نکل چکا تھا۔ یہی ہوگا کہ کھانے پر آجائیں گے نا؟ گھر پر کوئی گارڈ نہیں رکھتا تھا، اس وقت خیال آیا کہ ان دنوں رکھنی چاہئے تھی۔ گاڑی لے کر سڑک پر نکلا تو ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مجھے خوف ہوا

کدراستے میں روک نہ لیا جاؤں۔ اگر جنرل ضیا کا اندازہ تھا کہ فوج حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے تو اس موقع پر فوج کا رد عمل لازم تھا اور یہی موقع تھا کہ کارروائی کو روکا جاسکے۔ ان دنوں ISI کے پاس SSG کی کافی سپاہ ہوتی تھی۔ تین لوگوں کو ہی تو روکنا تھا۔ 9/11 سے پہلے گارڈ ساتھ لے کر چلنے کا رواج بھی نہ تھا، آسانی سے سارا معاملہ ٹھپ کیا جاسکتا تھا۔ مگر کوئی رکاوٹ کہیں نہ ملی۔ جنرل عزیز اور جنرل محمودی ایک ساتھ نہیں کھیل رہے تھے، وہیں ٹھہرائے جاسکتے تھے۔ حکومت کو اس رد عمل کی توقع ضرور تھی، کیونکہ اسلام آباد میں جگہ جگہ پولیس تعینات کی گئی تھی اور پولیس کی بکتر بند گاڑیاں سڑکوں پر کھڑی تھیں۔ ہم نے بھی بے وقوفی کی کد گارڈ نہ رکھی اور ان کے ہاتھ سے بھی سنہری موقع نکل گیا۔ جتنا بھی سوچو، کچھ نہ کچھ رہی جاتا ہے۔ اللہ ہی جودر چاہے پورا کرتا ہے۔

دفتر پہنچ کر جنرل عزیز کو فون کیا، پتا چلا کہ جنرل محمود 111 بریگیڈ کو ”گو“ (GO) دے چکے ہیں۔ کہنے لگے تم باقی جگہوں پر کارروائی شروع کرو، اوہ میں دفتر پہنچ رہا ہوں۔ سب سے اہم مسئلہ تو اسلام آباد اور راولپنڈی کی کا ہی تھا، ان میں ہونے والی کارروائیوں کو مانیٹر (monitor) کرنا تھا۔ صدر اور وزیر اعظم کے گھروں اور دفاتروں کے علاوہ ٹیلیفون انکسپیکٹور اور ان کا سارا مواصلاتی نظام، موبائل ٹیلیفون کا نظام، ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن، ہوائی اڈہ، ریلوے اسٹیشن، بجلی کا نظام، شہر سے آنے جانے کے راستے اور ایسی اور مختلف اہم چیزوں کو بھی اپنے قابو میں کرنا تھا۔ فوج کے بھی مواصلاتی نظام کو دیکھنا تھا۔ ان سب کارروائیوں پر نظر رکھنی ضروری تھی۔ پہلے سے تمام کو احکامات تو دیئے نہیں تھے کہ سب اپنا اپنا کام جانتے ہوں۔ ایک ایک کو بتانا تھا، ہر لمحے کی خبر رکھنی تھی۔

جب جنرل عزیز میرے دفتر پہنچے تو انہوں نے کہا کہ کراچی کے کورکمانڈر سے میں خود بات کر لوں گا، آپ باقی چیزوں کو سنبھالیں۔ یہ کہہ کر اپنے دفتر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد لوٹے اور پھر میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ کبھی اٹھ کر چلے جاتے، پھر کچھ دیر میں واپس آ جاتے۔ اس طرح ان کو بھی خبر رہتی، کیونکہ سارا کام MO سے ہی ہو رہا تھا۔ میرے پاس فوج کا سب سے بہترین اسٹاف تھا، جو ذرا نہ چوکتا۔

جنرل مشرف سری لنکا سے چلے گئے تھے، جہاز کراچی کی طرف پرواز میں تھا۔ ملیر کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل افتخار خان کو فون کیا، حالات بتائے اور کہا کہ فوراً ایئر پورٹ پہنچیں اور اس کا کنٹرول سنبھال لیں، جنرل مشرف کا جہاز آنے والا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی ایئر پورٹ پہنچتے لاہور فون کیا تو پتا چلا کہ کورکمانڈر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول غیر حاضر ہیں۔ ڈھونڈنے پر پتہ چلا کہ گوجرانوالہ گالف کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ کورکمانڈر جب بھی اپنے علاقے سے باہر جاتے ہیں، CGS کو لازماً خبر ہوتی ہے، لیکن آج کسی کو ان کی لاہور سے غیر حاضری کا پتہ نہیں تھا۔ گالف کورس میں بھی وہ کافی دیر نڈل سکے۔ میجر جنرل طارق مجید (بعد میں جنرل بنے اور چیئر مین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی تعینات ہوئے) کو فون کیا، جولاہور میں ڈویژن کمانڈر کہہ رہے تھے۔ ان کو تمام احکامات دیئے اور کہا کہ آپ کورکمانڈر کے آنے تک کورکمانڈر سنبھال لیں۔ قابل اور بھرپور سے والے افسر تھے اور انہوں نے نہایت حوصلے اور خوش اسلوبی سے لاہور کو سنبھالا۔

کوئٹہ میں کورکمانڈر پر تو بھروسہ رہا نہیں تھا۔ دو ڈویژن کمانڈر تھے، دونوں غیر حاضری اور تمام حالات سے بے خبر تھے۔ پتا چلا کہ دونوں کورکمانڈر کے ساتھ ان کے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ میننگ چل رہی ہے۔ یقیناً کورکمانڈر کو پتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے، اسی لیے انہوں نے دونوں چیزوں کو اپنے پاس ہی رکھا کہ ان کو کوئی احکامات نہ مل سکیں۔ بعد میں پتا چلا کہ جنرل TP ٹی وی دیکھتے رہے اور لگا تار لوگوں سے فون پر حالات پوچھتے رہے۔ کوئی چارہ سمجھ نہ آیا۔ پھر ایک بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر غضنفر (بعد میں میجر جنرل بنے) جو میرے کورس میٹ تھے، لیکن ابھی پرومٹ نہیں ہوئے تھے، ان سے بات کی اور صورت حال بتائی۔ ان کو بتایا کہ دونوں ڈویژن کمانڈروں کو کورکمانڈر نے اپنے دفتر میننگ کے بہانے بٹھایا ہوا ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کاب یہ تمام کام آپ ہی کریں۔ انہوں نے ہامی بھری، پھر کوئٹہ کو سنبھالا بھی۔

پشاور کے کورکمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سعید الظفر کے بارے میں جنرل مشرف اتنے پراعتقاد نہیں تھے۔ جب وہ سری لنکا جا رہے تھے تو آخری ملاقات میں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ان کے جانے پر فوج کی کمانڈ سونپنے کے بارے میں کیا کیا جائے۔ اصولی طور پر جب بھی چیف باہر جاتے ہیں، فوج کی کمانڈ سب سے سینئر کورکمانڈر کو دی جاتی ہے۔ فوج کی برسلز پر بھی دستور ہے کہ ٹیچلے کمانڈروں میں سب سے سینئر کورکمانڈر سونپی جائے۔ کبھی کمانڈر سونپنے بغیر کمانڈر اپنی سپاہ کو نہیں چھوڑتا۔ اب پشاور کورکمانڈر کو ایسے موقع پر فوج کی کمانڈ دینے پر وہ رضامند نہ تھے، اس لیے بغیر کسی کورکمانڈر سونپنے چلے گئے۔ کہہ دیا تھا کہ اس مسئلے کو نہ اٹھاؤ۔ اگر ان کی غیر حاضری میں کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا تو ملک میں آفت آ جاتی۔ فوج بغیر کمانڈر کے تھی۔ جنرل عزیز نے مجھ سے کہا کہ آج بھی ان سے بات نہ کروں اور پشاور کو اس کارروائی سے باہر رہنے دوں۔

پھر راولپنڈی کے ارد گرد دفاعی سپاہ بھی تعینات کرتی تھی۔ یہ تو نہیں پتا تھا کہ پشاور یا کھاریاں کی سمت سے کوئی دشمن اندازہ ہوگی یا نہیں۔ وہاں بہت مضبوط سپاہ موجود تھی۔ سب تو اس منصوبے میں پہلے سے شامل تھے نہیں، کیا پتا تھا ان کی وفاداریاں کس سمت میں ہیں۔ مسئلہ صرف فوج اور سول حکومت کا نہیں تھا، فوج کا ایک نیا سربراہ تعینات ہو چکا تھا، جو ISI جیسے ادارے کا سربراہ تھا اور فوج میں اس کی عزت تھی، اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ پھر اس مسئلے کی کچھڑی دونوں جانب سے کئی دنوں سے پک رہی تھی۔ نہ جانے کون کدھر تھا۔ راولپنڈی میں تو ایک ہی بریگیڈ تھا، جو اسلام آباد کی نذر ہو گیا۔ ضرورت کے تحت 10 کورکمانڈر ڈویژن منگلا سے منگوایا، جس کی کمانڈ میجر جنرل عارف حسن (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے) کر رہے تھے۔ یہ سپاہ کھاریاں اور پشاور سے مداخلت کی صورت میں، یقیناً کافی تھی، خدا شواستہ اگر ایسا مسئلہ اٹھ جاتا تو فوج آپس میں الجھ جاتی، تو ہاتھ ہو جاتی۔ بس صرف ایک ایسی صورت حال پیدا کرنی تھی کہ مداخلت کرنے والا سوچے کہ مداخلت کا فوج کے لیے کیا انجام ہو سکتا ہے اور باز رہے۔

اسلام آباد میں پرائم منسٹر اور پریذیڈنٹ ہاؤس گھیرے میں لیے جا چکے تھے۔ پھر میں نے پریذیڈنٹ ہاؤس کی بلائیں سے ایک میجر صاحب، کچھ سپاہ کے ساتھ ٹی وی اسٹیشن کو کنٹرول میں لینے کے لیے بھیجے تاکہ وہاں سے جو لگا تار نئے چیف کوریک کے بیچ لگنے کی ویڈیو چل رہی تھی اسے بند کر دیا جائے۔ تب یہ سلسلہ بند ہوا۔ مگر کچھ دیر میں پھر ٹی وی اسٹیشن سے جنرل ضیا اور نواز شریف کی ویڈیو چلنی شروع ہو گئی۔ میں نے جب پتا کیا تو بتایا گیا کہ ٹی وی اسٹیشن پر تو ہمارا کنٹرول ہو چکا ہے، نہ جانے کیا مسئلہ ہے۔ اتنا بڑا اسٹیشن ہے، ہو سکتا ہے کنٹرول روم نڈل رہا ہو یا کوئی اور مسئلہ پیش ہو۔ میں نے کہا اگر ان سے ٹی وی اسٹیشن نہیں سنبھالا جاتا تو اسے بند کروادو۔ ابھی وقت نہیں تھا کہ میں اس مسئلے میں الجھتا۔ جب ٹی وی اسٹیشن پر بھیجے ہوئے افسر سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا تو انہوں نے ایک اور افسر کے ساتھ کچھ سپاہی یہ حکم دے کر بھیجوائے کئی وی کی نشریات بند کر دی جائیں۔

جب ٹی وی پر نواز شریف صاحب کی ویڈیو چلنی بند ہوئی، تو انہوں نے بریگیڈیئر جاوید اقبال کو بھیجا، جو PM کے اسٹاف افسر تھے کہ دیکھ کر آئیں کیا مسئلہ ہے۔ جب وہ وردی میں وہاں پہنچے تو وہاں موجود میجر صاحب نے انہیں سیلوٹ کیا اور دستور کے مطابق اپنی کارروائی کی رپورٹ دی، بتایا کہ میں نے نئے چیف کی ویڈیو بند کرادی ہے۔ انہوں نے سمجھا بریگیڈیئر صاحب ان کے ہی ساتھ ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب نے انہیں پھسلا کر ان کا ہتھیار لے لیا اور تمام سپاہ کو ہتھیار لینے کے بعد ایک کمرے میں کیا اور باہر سے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ ٹی وی والوں کو حکم دیا کہ وہی ویڈیو چلاتے رہیں اور اعلان کرتے رہیں کہ نیا آرمی چیف لگایا جا چکا ہے اور ٹی وی اسٹیشن کے گیٹ پر بھی تالا لگا کر واپس PM ہاؤس چلے گئے۔ وہاں گیٹ پر موجود سپاہیوں نے نہ ہی انہیں باہر جانے سے روکا اور نہ ہی واپس پر۔ پھر جب اور سپاہی ٹی وی اسٹیشن پہنچے تو انہوں نے آکر دوبارہ ٹی وی اسٹیشن کا کنٹرول سنبھالا اور بند کرے سے اپنے ساتھیوں کو نکالا۔ جو ٹی وی پر سپاہیوں کی گیٹ پھلانگتے ہوئے تصویریں دکھائی جاتی تھیں وہ ان ہی کی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ٹی وی اسٹیشن بند کر دیا گیا۔ مجھے یہ کہانی بہت بعد میں پتا چلی، ورنہ ٹی وی کی نشریات بند نہ کرواتا۔ لیکن اس وقت بڑے اہم اور درجن (urgent) مسئلے تھے، نہ کئی وی اسٹیشن۔ کراچی میں ایئر پورٹ کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی اور وقت کم رہ گیا تھا۔

ایک اور پریشان کن خبر یہ تھی کہ کھاریاں میں کچھ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر مبنی سپاہ کو اسلام آباد جانے کے لیے تیار رہنے کے احکامات دیئے گئے ہیں۔ راولپنڈی میں ان کے مقابلے کی سپاہ موجود نہیں تھی۔ اس ممکنہ پیچیدگی کے لیے بھی دفاعی اقدامات کرنے تھے۔ کھاریاں کی یہ سپاہ رات دیر تک تیار ہی رہی اور ایک مرتبہ گاڑیوں میں بھی بیٹھ گئی، مگر یہ چلے نہیں۔ ہمارے لیے رات گئے تک پریشانی کا سبب رہے۔ پھر جب جنرل مشرف کا جہاز خیریت سے اتر گیا اور PM صاحب حراست میں لے لیے گئے تو کچھ دیر بعد یہ بھی آرام سے بیٹھ گئے۔

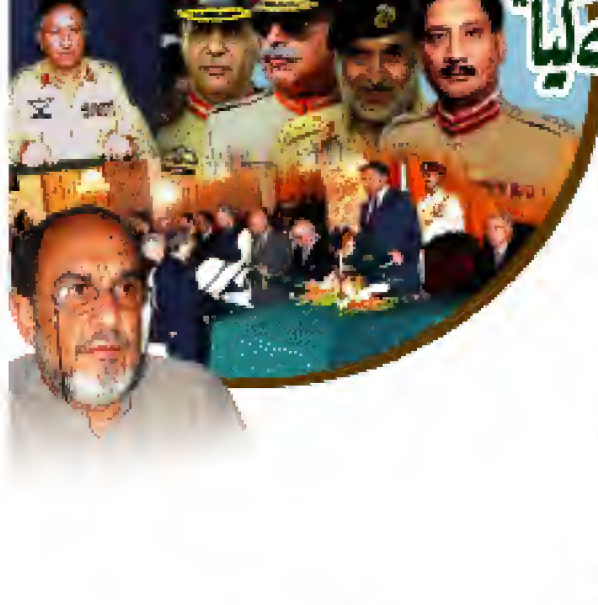
خبر ملی کہ کراچی ایئر پورٹ پر اب تک فوج نہیں پہنچی اور جنرل مشرف کا جہاز قریب پہنچ رہا ہے۔ دوبارہ لیور فون کیا، پھر ڈویژن کمانڈر نے یہی کہا کہ ابھی ہم ایئر پورٹ پہنچتے ہیں۔ وقت کم تھا۔ بریگیڈیئر جبار بھی کو، جو بہت باہمت اور حوصلے والے افسر تھے (میجر جنرل بنے) اور ملیر میں ایک بریگیڈ کمانڈر کہہ رہے تھے، ایئر پورٹ کی طرف بھیجا اور وہ فوراً ہی پہنچ گئے۔ چونکہ پہلے سے تیاری نہیں تھی اس لیے پرانے ایئر پورٹ کے کنٹرول ٹاور پر جا نکلے۔ پھر وہاں سے نئے کی طرف چلے۔

دن دسے کی تمام بتیاں بند تھیں اور اس پر آگ بجھانے والی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایئر ٹریفک کنٹرول (ATC) میں پہنچے تو پتا چلا کہ جہاز نوابشاہ کی طرف جا رہا ہے۔ جب میں نے نوابشاہ سے پتا کیا تو اٹلی جنس والوں نے رپورٹ دی کہ پولیس کی بھاری نفری ایک DIG کی قیادت میں ایئر پورٹ پر جنرل مشرف کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے موجود ہے۔ بریگیڈیئر جبار بھی ہے کہ جہاز کو فوراً واپس کراچی کی طرف موڑیں اور دن دسے کو خالی کر دائیں۔ پائلٹ پہلے تو آمادہ نہیں تھا، کہنے لگا کہ بمشکل کراچی پہنچ سکتا ہوں۔ اسے کہا کہ فوراً جہاز کو واپس موڑو۔ نہایت تناؤ (tense) کے لمحے تھے۔ نہ جانے کراچی ایئر پورٹ پر سپاہ کے پہنچنے میں دیر کیوں ہوئی؟ پھر جنرل افتخار بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہوائی جہاز میں بیٹھے جنرل مشرف سے رابطہ کیا۔ چند منٹ ہی کا فرق تھا، ورنہ جہاز گر کر تباہ ہو جاتا۔ پائلٹ کا ہی حوصلہ تھا جو اس نے اتنا بڑا اقدام اٹھایا۔ جب جہاز اتر گیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ کراچی کے کورکمانڈر جنرل مشرف کو لینے ایئر پورٹ پہنچے ہوئے تھے۔

وقت ایسا تھا کہ جگہ جگہ لوگ غائب تھے۔ کچھ نے تو جب خبر سنیں، دپک کر بیٹھ رہے۔ سوچا دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ کئی جگہوں پر تو جب متعلقہ افسر کو بتا دیا اور اس نے ہامی بھی بھری، ہمیں تسلی بھی دے دی، پھر بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں۔ انتظار میں رہا کہ وفاداریاں کہاں دکھلاؤں۔ ایسے موقعوں پر پتا چلتا ہے کہ انسانی وفاداریاں کیسے بدلتی ہیں۔

جب وزیر اعظم کے گھر گلی پلٹن کے CO کرنل شاہد علی (بریگیڈیئر بنے) پرائم منسٹر ہاؤس کے گیٹ کے اندر گئے تو وہاں جنرل ضیا الدین کی گاڑی چار ستاروں اور چیف کے جھنڈے کے ساتھ کھڑی تھی۔ یہیں انہیں چیف کے ریک لگی وردی میں جنرل ضیا، وردی میں لیفٹیننٹ جنرل اکرم اور بریگیڈیئر جاوید کچھ اور ساتھیوں کے ہمراہ ملے۔ ان کے ساتھ ہتھیاروں سمیت گارڈ بھی تھی۔ کرنل شاہد علی نے مجھے بعد میں بتایا کہ ان دنوں نے پہلے تو انہیں ڈرایا دھمکیا، پھر لالچ دی کہ تم فکر نہ کرو ایسے موقع پر انسان سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جاتی ہے، ہم تمہارا خاص خیال رکھیں گے۔ پھر جب وہ نہ مانے تو یہ بھی کہا کہ ابھی کچھ دیر میں پشاور سے سپاہ پہنچ جائے گی، تو تم لوگوں کا یہ سارا ڈرامہ دھڑا کا دھڑا کر دیا جائے گا تو بہت خسارے میں رہو گے۔ پھر یہاں موجود سپاہ نے ان پر ہتھیار تان لیے اور کہا گیا کہ اپنی پلٹن کے لوگوں کو فوراً گیٹ سے ہٹ جانے کا حکم دو اور نئے چیف کو GHQ پہنچنے دو، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ کرنل صاحب نے جواب دیا کہ اگر گولی چلائی تو میرے جوانوں نے پورا گھر گھرے میں لیا ہوا ہے، کسی کی بھی خیر نہیں ہوگی۔ اس نوجوان افسر کا حوصلہ تھا کہ یہ یوں اکیلے کھڑا رہا۔ پھر باقی سب گھر کے اندر چلے گئے۔

کچھ دیر پہلے جنرل محمود بھی میرے دفتر میں آچکے تھے اور ان کے ساتھ میجر جنرل عارف حسن بھی۔ میرے دفتر میں بیٹھے جنرل عزیز سے بات کرتے رہے، پھر جنرل محمود اور عارف حسن اٹھ کر وزیر اعظم اور ان کے ساتھیوں کو تحویل میں لینے چلے گئے۔ رات کے ڈھائی بجے جنرل مشرف نے SSG کی وردی پہن کر، ملک کے نئے سربراہ کی حیثیت سے ٹی وی پر قوم سے خطاب کیا۔ اللہ کا کرنا ہے کہ آج، جب میں یہ لکھ رہا ہوں، 12 اکتوبر 2011ء ہے۔ بارہ سال ہو گئے اس دن کو جب میرے دفتر سے نکلے ہوئے احکامات پر ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی۔ ہم سب نے چین کا سانس لیا تھا۔ سڑکوں پر لوگ نکل کرنا چہ تھے، مضامیناں بانٹیں گیں۔ کیا علم تھا کہ ہم راہ ہی میں کھو جائیں گے قوم کی امیدوں کا خون ہوگا۔ (جاری ہے)



”شرف کابینہ کے ارکان کا ہٹاؤ جنرل عزیز جنرل لہسان نے کیا“

وزارت داخلہ - خارجہ - اطلاعات اور مالیاتی اداروں سے متعلق

لوگ پہلے ہی چنے جا چکے تھے۔ فوج کے سینئر افسران کی اہم

جگہوں پر تبدیلیوں سے اختلافات شروع ہوئے مشرف نے

کراچی سے آتے ہی قریبی ساتھیوں سے خفیہ میٹنگز شروع کر دی

تھیں۔ ان اجلاس سے مجھے باہر رکھا جاتا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر و سرور جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلاقی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی جنگ کی حیثیت سے ہر گل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ یا علی فوجی حکام کو فراموشی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔



”تم وہ بات جنرل مشرف کو بتاؤ نا، جو مجھ سے کہہ رہے تھے“ ہمارے دوست نے کہا۔ میں چونک پڑا اور کہا نہیں وہ تو ویسے ہی ایک خدشے کا آپ سے ذکر کیا تھا، کوئی مستند بات تو نہیں۔ جنرل مشرف نے کہا ”نہیں نہیں بتاؤ“ تو میں نے کہا کہ سینئر افسران کے تبادلے اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں تو بہتر ہوگا۔ کہنے لگے کیا تم کہہ رہے ہو کہ میرے ساتھی اعتبار کے لائق نہیں؟ میں نے کہا میرا ہرگز یہ مطلب نہیں، مگر ان کے جملے نے مجھے غریب رنگ میں ڈھال دیا تھا۔ کہنے لگے ”نہیں یہ بہت اچھے لوگ ہیں، تم غلط سمجھتے ہو۔ آخر کن وجوہات پر تم نے یوں سوچا؟“ اصرار کرنے لگے کہ میں اپنی صفائی پیش کروں، کچھ ناراضگی بھی چہرے پر آگئی۔ میرے پاس تو کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی، کیا کہتا۔ میں تو ایک اصولی سی بات کر رہا تھا۔ فوجی حکومت کو آئے ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جنرل مشرف نے مجھے اور انجمن کو کھانے پر اپنے گھر بلایا۔ ایک اور صاحب بھی مدعو تھے، جو ہم دونوں کے قریب تھے۔ ہم پہلے ان کے گھر چلے گئے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ ان صاحب کے پوچھنے پر کہ کیا ہو رہا ہے، میں نے کہا، میں بھی وہی جانتا ہوں جو آپ اخبار میں پڑھتے ہیں۔ بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے تم معاملات میں شامل رہا کرو، جنرل مشرف کو یوں تنہا نہ چھوڑو۔ میں نے کہا کہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں، مگر ایک بات ہے جس کا جنرل مشرف کو خیال رکھنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک فوج کے سینئر افسران کی تعیناتی کا سوال ہے، جنرل مشرف کو یہ سلسلہ اپنے ہاتھ ہی میں رکھنا

چاہیے۔ یہ بات مجھے ذرا پریشان کرتی ہے۔ پھر ہم اٹھ کر آئی ہاؤس چلے گئے۔ کھانے کے بعد جب بیٹھے تو پاکستان کے بارے میں بات چیت شروع ہوگئی۔ اس دوران ہمارے دوست نے اچانک مجھے یہ کہہ کر چونکا دیا کہ یہ بات جنرل مشرف کو بھی بتاؤں۔ پھر جنرل مشرف کی آنکھوں سے

جھلکا کہ انہوں نے میری باتوں سے کچھ اور ہی سمجھا، جو میں کہہ نہیں رہا تھا۔

ہاں، اتنا ضرور تھا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد تمام معاملات سے مجھے باہر رکھا جاتا، جو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ آخر مجھے ہی کیوں اس اعتبار کے

دائرے سے باہر رکھا جاتا ہے۔ سوچا شاید اس لیے کہ میں کھری بات سب کے سامنے کہہ دیتا ہوں، سچ ابا کر دیتا ہوں، جیسے سری لنکا جانے سے

پہلے کی ایک ملاقات میں تختہ الٹنے کی تیاری کا خط لکھنے پر کیا تھا، جس پر سب ہی خفا تھے۔ شاید ناموزوں سوالات بھی پوچھتا ہوں اور شاید جنرل محمود اور

جنرل عزیز نہیں چاہتے تھے کہ میری موجودگی سے جنرل مشرف اُن چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ جائیں جن سے اُن کو ناواقف رکھنا ہی بہتر ہو۔ شاید

میری موجودگی کچھ ایسے مسائل پیدا کرتی ہو۔ میں نے جنرل مشرف یہی کہہ دیا کہ میں ہر حکومتی معاملے سے باہر رہتا ہوں، شاید اس وجہ سے مجھے یہ

خیال آیا ہو۔ اب اتنے اصرار پر اور کیا جواب دیتا؟ انہوں نے عجیب طرح سے مجھے دیکھا۔ پھر ہم سب اٹھ کر آ گئے۔

مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے انہوں نے سوچا ہو کہ میں یہ باتیں کہہ کر اپنی مخصوص وقاداریاں دکھانا چاہتا ہوں، تاکہ ان کے قریب آسکوں۔ اس سوچ

سے مجھے سخت کوفت ہوئی اور شاید ان دنوں سے قدرتی طور پر میرا رویہ کچھ اس طرح کھنچا ہوا ہو گیا کہ اُن پر یہ بات واضح ہو جائے کہ میں اتنا گرا ہوا نہیں

جتنا انہوں نے سمجھا۔ شاید میں اپنے غلوں پر یہ دھچکا برداشت نہ کر پایا۔ شاید میری اپنا پھر آڑے آگئی۔ کہہ نہیں سکتا کہ میری اس فطری کمزوری کا

ہمارے بیچ تناؤ میں کتنا دخل رہا، مگر یہ تناؤ کبھی ختم نہ ہوا۔ چھپا رہا، بڑھتا رہا۔ ہر ملاقات میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی جو انڈر کرٹس (under

currents) چھوڑ جاتی، مگر میں نے ہمیشہ ہی سچائی سے ان کا ساتھ دیا، کبھی کسی بات پر انہیں دھوکے میں نہیں رکھا اور نہ ہی کوئی ڈھکی چھپی بات کی۔

جب تک ان کا ساتھی تھا، ساتھ دیا، آخری دن تک۔ جو غلط سمجھا، نہیں کیا۔ جو کتنا تھا صاف کہا۔

ان دنوں جنرل مشرف بہت پر عزم دکھائی دیتے اور میں سمجھتا ہوں کہ یقیناً وہ قوم کے آنسو پونچھنا چاہتے تھے، چیزوں کو بدلنا چاہتے تھے اور اس کی

صلاحیت اور طاقت بھی رکھتے تھے۔ میں کہہ نہیں سکتا، کیا رکاوٹیں اور مسائل پیش آئے کہ یہ سب کچھ ہو نہ سکا۔ ان باتوں کو شاید وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس

نے یہ بھاری ذمہ داری اٹھائی ہو۔ میرا باہر سے بیٹھ کر تنقید کرنا آسان ہے۔ انہوں نے بہت غلوں اور لگن سے کام شروع کیا اور بہت سے مسائل پر جلد

قابو پایا۔ اس ملک کو بہت کچھ دیا۔ پھر بھی، میں اُن چند اسباب کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا جن سے میرے وجود میں لپکتے شعلے سرد ہوئے، امیدیں

خاک میں ملیں۔ جنرل مشرف کے کراچی سے آتے ہی، قریبی ساتھیوں کے ساتھ اُن کی متواتر میٹنگز شروع ہو گئیں۔ صبح سے رات دیر لگے تک یہ

سلسلہ جاری رہتا۔ ان میٹنگز میں شامل ہوتے لیفٹیننٹ جنرل محمود (جو DGISI تعینات ہوئے)، لیفٹیننٹ جنرل عزیز (CGS)، جنرل غلام احمد

(چیف آف اسٹاف - COS)، جو GA کہلاتے تھے، ہر دل عزیز انسان تھے، اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ ہم ISI میں اکٹھے رہے تھے)، میجر

جنرل احسان (DGMI)، بریگیڈیئر راشد قریشی (DGISPR) اور طارق عزیز صاحب (اُن کے پرنسپل سیکریٹری)۔ میں GHQ ہی میں رہتا

اور کچھ علم نہ ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس وہی جانتا جو اخباروں میں پڑھتا۔ اس عرصے میں کابینہ (cabinet) کے لیے لوگوں کا چناؤ بھی شروع ہو

گیا۔ انٹرویو جنرل عزیز کے دفتر میں ہوتے، جن میں جنرل احسان موجود ہوتے اور عموماً جنرل محمود، جنرل GA یا طارق عزیز صاحب بھی آ جاتے۔

میں باہر ہی رہتا۔ پھر کچھ فوج کے سینئر افسران کی اہم جگہوں پر تبدیلیاں ہوئیں، جن کے بارے میں مجھے علم ہوا کہ یہ جنرل محمود اور جنرل عزیز نے

کر دیا۔ اس ہی پر نکتہ چینی سے جنرل مشرف کے ساتھ تناؤ شروع ہوا۔ اُس رات کے بعد دوسرے دن جب کابینہ کے انٹرویو ہونے لگے تو جنرل

عزیز نے مجھے بھی بلوایا۔ یقیناً جنرل مشرف نے کچھ کہا ہوگا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے، ہم سب ہی ملک کے کاموں میں بہت مصروف رہتے ہیں،

اس لیے تمہیں GHQ میں چھوڑ جاتے ہیں تاکہ تم فوج کو سنبھالے رہو (somebody to hold the fort)۔ ہم دونوں میں بہت اچھا تعلق

تھا اور مجھے اُن کے غلوں پر ذرا شک نہ تھا، میں کیا کہتا۔ بس اُس رات یوں ہی تقدیر کے ہاتھوں الجھ گیا تھا، حالانکہ کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ زندگی بے ترتیب

سی ہی چلتی ہے، جیسے نیم تاریکی میں پتھر لی ڈھلوان پر ٹھوکریں کھاتے۔ سمجھتا ہوں کہ اختیار رکھتا ہوں، مگر کسی لمحے پر بھی قادر نہیں۔ کابینہ کے لیے

انٹرویو میرے لیے ایک عجیب سا نمائندہ تھے۔ اچانک فون آتا کہ آج آؤ۔ جنرل عزیز کے دفتر میں عموماً جنرل احسان پہلے سے موجود ہوتے۔ جو لوگ آ

رہے ہوتے اُن کے بارے میں معلومات بتاتے۔ پھر کچھ لوگ آتے تو ہم اُن سے یوں ہی ادھر ادھر کے سوال پوچھتے۔ جب میں نے جانا چاہا کہ یہ

نام کیسے چنے جاتے ہیں تو بتایا گیا کہ ایک لمبی ترتیب ہے۔ جنرل احسان مختلف جگہوں سے نام تلاش کرتے ہیں پھر اُن کے بارے میں معلومات

حاصل کرتے ہیں، پھر کچھ کا چناؤ کر کے انٹرویو کے لیے بلوایا جاتا ہے۔ میرے پاس بھی ڈاک میں سینکڑوں لوگوں کی پیشکش آتی کہ میں قوم کی خدمت

کے لیے حاضر ہوں۔ میں یہ تمام کاغذات DGMI کو بھیجا دیتا۔ کبھی کسی ایک کی بھی سفارش نہیں کی۔ میں منصفانہ نظام چاہتا تھا، خود ہی اس کو چھیڑ کر

کیسے خراب کرتا۔ آج بھی مجھ سے بہت سے لوگ ان جیسی باتوں پر نالاں ہیں۔ کچھ میرے رشتے دار بھی اور بہت سے احباب بھی۔ اللہ سے ڈرتا ہوں

کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ کبھی یوں لگتا جیسے چناؤ انٹرویو سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ صرف شکل دیکھنی ہے یا یوں ہی کارروائی پوری کرنی ہے۔ لیکن یہ

صرف میرا اندازہ تھا، ووثق سے نہیں کہہ سکتا۔ مذہبی امور کی وزارت کے لیے جب انٹرویو ہو گیا تو میں نے کہا کہ یہ صاحب تو اس کام کے لیے بالکل

مناسب نہیں، کیونکہ اُن کا پرانہ ریکارڈ بھی کچھ مشکوک سا تھا اور مجھے یوں بھی اس کام کے لیے پسند نہ آئے۔ لیکن کہا گیا کہ یہی ٹھیک ہیں۔ شاید سرکاری

عالم دین ایسے ہی بہتر ہوتے ہوں، جو آسانی سے مڑ سکیں۔ دین کے شرعی احکام کی وہ تفریق کریں جو حکمران کو موافق آئے۔ ہماری معیشت اور مالیاتی

اداروں سے متعلق جو لوگ آئے وہ پہلے ہی چنے جا چکے تھے۔ بتایا گیا کہ شوکت عزیز صاحب فنانس (finance) منسٹر ہوں گے، انٹرویو نہیں ہوگا۔

تمام منسٹریاں جن کا ہماری معیشت پر براہ راست اثر پڑتا ہے اور اُن سے منسلک مالیاتی اداروں وغیرہ کے لیے اپنی ٹیم کا چناؤ بھی شوکت عزیز صاحب

خود ہی کریں گے۔ ان میں ٹریڈ (trade)، کامرس (commerce)، انڈسٹری (industry)، پرائیویٹائزیشن (privatisation) وغیرہ

کے کابینہ ممبران شامل تھے۔ پیٹرولیم منسٹری کے لیے بھی چناؤ پہلے کا تھا۔ لیکن ان سب کو بلایا ضرور گیا کہ دیکھی لیں۔ باقی کارگر جگہوں میں ایک

وزیر داخلہ، ایک وزیر اطلاعات اور دفتر خارجہ جی رہ گئے، جن کا چناؤ بھی اس انٹرویو کے سلسلے سے باہر ہی ہوا۔ البتہ شوکت عزیز صاحب کے علاوہ

سب ہی نے چہرہ کرایا۔ شروع میں کابینہ کے علاوہ ماہرین کی ایک مشاورتی ٹیم بھی چنی گئی، جس میں خاص کر معیشت سے متعلق ماہرین بھی شامل

تھے، تاکہ جنرل مشرف کو فیصلہ کرنے میں مشورہ دے سکیں اور ایک مختلف نکتہ نظر بھی اُن کے سامنے ہو۔ کرپشن کی روک تھام کے لیے NAB (قومی

احتساب بیورو) کا ادارہ کیا گیا اور اس کی سربراہی کے لیے فوج سے لیفٹیننٹ جنرل محمد امجد کا چناؤ ہوا، جس پر سب ہی خوش تھے۔ ملک میں پھیلی ہوئی

کرپشن ہم سب کے لیے بہت اہم مسئلہ تھی۔ ہر ایک جانتا تھا کہ باقی ہر مسئلے میں اس کی جڑیں پہنچتی ہیں۔ حکومت میں رد و بدل کی تجاویز تیار کرنے کے

لیے جنرل رٹائرڈ خٹویر حسین نقوی کو چنا گیا۔ یہ دونوں افسر باصلاحیت اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ ان کا فوج میں بہت نام تھا۔ پولیس اور انصاف

کے نظام میں بہتری لانے کے لیے بھی فوری کام شروع کر دیا گیا۔ عدلیہ اور پولیس کا نظام ٹھیک کرنا اُن دنوں ہماری اہم ترجیح تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سول

سروس (civil service) کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے بھی کوششیں شروع ہو گئیں۔ جتنے بھی لوگ مختلف جگہوں پر تعینات ہوئے، سب ہی

قابلیت رکھتے تھے۔ ہم سب بھی بہت پُر امید تھے کہ اب ہمارے ملک کا نظام سنبھل جائے گا۔ اس کابینہ کی امداد میں مانیٹرنگ (monitoring)

کا نظام میں نے تشکیل دیا، پھر ٹی وی پر اس کی تفصیلات بھی بیان کیں۔ میں ہی، DGMO کی حیثیت سے اس نظام کی سربراہی کرتا اور تمام پاکستان

سے آئی ہوئی رپورٹوں کو چھانٹ کر متعلقہ وزیروں کو بھیجتا اور ایک کاپی چیف ایگزیکٹو (Chief Executive) کے دفتر بھی۔ ہمارا بس اتنا ہی کام

تھا۔ ہم صرف اُن سے سوال کرنے کے مجاز تھے، کوئی احکامات جاری کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ فوج کسی چیز میں مداخلت نہیں کرے گی،

جب تک حکومت اُس سے کسی سلسلے میں امداد مانگے۔ صرف غلطی سطحوں پر حکومت کی کارروائیاں پر نظر رکھے گی، تاکہ جتنی ہوئی جنرل مشرف کی ٹیم کو

باخبر رکھ سکے کہ ان کے احکامات پر اور حکومت کی پالیسیوں پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ کابینہ کو کسی مخصوص چیز کے بارے میں بتا کرنا

ہوتا تو ہم سے کہہ دیتے، ہم اُس کی رپورٹ بنا کر انہیں بھیج دیتے۔ اگر ان کے سامنے صحیح تصویر ہوگی، تو وہ درست فیصلے کر سکیں گے اور حکومت کی

کارکردگی بہتر ہوگی۔ اس طرح عوام اچھی حکومت (good governance) کے اثرات بھی جلد دیکھ پائیں گے۔ اس اصول پر مانیٹرنگ کا نظام

قائم ہوا۔ ہر طرف بہت جوش و خروش سے کام شروع ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ معاملات پر اُنے ڈگر پر ہی چلنے شروع ہو گئے۔ سول سروس کے جنود نے

کچھ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ ہر چیز میں اُن کے خدشات آڑے آ جاتے۔ انہیں اپنی آزادی پر کسی کی گرفت قبول نہیں تھی اور نہ ہی اپنی کارکردگی پر فوج

کی نظر۔ کابینہ ان کے بغیر نا کارہ تھی، حکمران بھی۔ سب اُن کے مہربان منت تھے۔ جو ماہرین کی مشاورتی ٹیم چنی گئی تھی اور جن کا دوسرا نکتہ نظر سول

سروس سے تصادم پیدا کرتا، جلد نا کارہ بنا دی گئی۔ مانیٹرنگ بھی جنرل مشرف پر بوجھ بن گئی اور وہ اس سے خفا رہے کیونکہ اس کے خلاف اُن پر سول

سروس کا دباؤ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ NAB بھی شوکت عزیز صاحب کے کہنے پر حکومت کے دباؤ میں آنا شروع ہو چکی تھی کہ اس سے معیشت کو

خطرہ ہے۔ ہر بات پر قومی مفاد کے جھوٹے نام پر مفاہمت (compromise) ہو رہی تھی، اسے لیے راستوں پر ڈالا جا رہا تھا تاکہ کسی انجام کو نہ

پہنچے۔ جنرل مشرف کو بھی ایسی پیچیدگیوں میں الجھا دیا تھا کہ اُن کے ہاتھ بندھ چکے تھے۔ کوئی سلسلہ بھی آگے بڑھتا نظر نہیں آتا تھا۔ اب گھاگ قسم کی

نوکر شاہی جنرل صاحب کی نئی ٹیم تھی، چونکہ اب ملک چلا تھا۔ نئی ٹیم کو خوش رکھنا تھا، انہیں خوش رکھا۔ قوم سے جھوٹ بولنے کا اور وعدوں کے دلاسوں کا

سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جب 12 اکتوبر 2000ء آیا، فوجی حکومت کی پہلی سالگرہ تو میں دفتر میں بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں اُس دن کوئی کام میرے

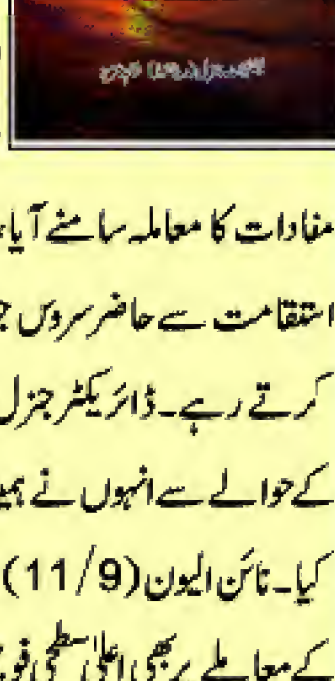
پاس نہیں آ رہا تھا۔ کافی دیر بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ذہن میں ایسے خیالات پھرتے رہے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سوچا، نہ جانے

اللہ کو کیا جواب دوں گا؟ فون اٹھا یا اور کہا کہ میری جج کے لیے سیٹ بک کروادیں۔ اب تک کہے کا ویدار نہیں کیا تھا۔ (جاری ہے)

فوج میں میوٹ کوراج دیا۔ کئی سفارشی افسروں کی ترقی کو انائی

حفہ دینے پر ایک افسر کو ڈانٹ پلا دی۔ اس سختی پر آج بھی لوگ مجھ سے ناراض ہیں۔ کشمیر میں رہنے ہوئے جارحانہ کارروائیوں کے منصوبے بنائے جج کے دوران کچھ کے سامنے روتا رہا۔ پھر بھی ہر شام گھنٹوں بیٹھا اپنے اندر غوطے کھاتا رہتا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی



منفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجویزاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجربہ ایملی فوجی حکام کو سمجھایا۔

کیا۔ ٹانک ایون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

”جنرل صاحب! آپ نے معلوم ہوتے ہیں۔“ میں سمجھا تو نہیں مگر میں نے ہاں کہا۔ بزرگ تھے، کہنے لگے۔ ”میرے پاس بیٹھیں۔“ میں بیٹھ گیا۔ 2001ء میں کشمیر کے الیکشن کا انتظام کر رہا تھا۔ MO سے تبدیل ہو کر مری میں ڈویژن کمانڈر تعینات ہوا تھا، کشمیر کے علاقے کا ذمہ دار تھا، جہاں سیاسی حکومت بدستور قائم تھی۔ جب اپنے کام سے اگلے مورچوں پر

جاتا، تو فارغ ہو کر وہاں کے لوگوں سے بھی مل لیتا کہ الیکشن کے سلسلے میں معلومات رہیں، اور لوگوں سے ملاقات بھی۔ ایک ایسی ہی چائے پر میں نے معمول کے مطابق لوگوں سے بات کی اور کہا کہ اچھے لوگوں کو ووٹ دیں تاکہ اچھی حکومت آئے اور آپ سب کا فائدہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔ جب اپنی سناچ کا توان بزرگ نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

کہنے لگے۔ ”آپ نے اچھی باتیں کیں، لیکن اگر ہم آپ کے کہنے کے مطابق اچھے لوگوں کو ووٹ دیں تو ہمارے علاقے کا اچھا نمائندہ مظفر آباد میں بیٹھ کر اچھی باتیں کرے گا اور اپنے تمام ساتھیوں کو ناراض کر دے گا، کیونکہ وہ باتیں ان سب پر چوٹ ہوں گی۔ پھر ہمارے سارے کام کیسے ہوں گے؟“ میں سنا رہا۔ کہنے لگے۔ ”ہمیں تو ایسا نمائندہ چاہئے جو باقی علاقوں کے ترقیاتی بجٹ موڈر کر ہمارے علاقے میں لگا دے، باقی

سب کے بچوں کو پیچھے دھکیل کر ہمارے بچوں کو نوکریاں دلوائے، ہمارے

تھانہ پکھری کے تمام معاملات نمٹائے۔ اب بھلا بتائیں کہ کیا ایک اچھا آدمی یہ سب کچھ کر سکے گا؟“ میں نے سر ہلایا تو کہا۔ ”پھر ہم اپنے پاؤں پر

کھڑی کیوں ماریں؟“ میں زمین کو نکتا رہا۔ ”اس نظام میں جہاں سارا گندا تاجا ہو، اچھے آدمی کا کیا کام؟ وہ تو نہ ہی جیت سکتا ہے اور نہ ہی جیت کر کچھ کر سکتا ہے۔ جب نظام اچھا ہوگا پھر ہم اچھے لوگوں کو چنیں گے۔“

ان بزرگ نے دنیا دیکھی تھی، سیاست کی اونچ نیچ سمجھتے تھے۔ ٹھیک کہتے تھے۔ ایک صاحب، جو بہت اچھا نام رکھتے تھے، میں سوچتا تھا اگر جیت گئے تو موزوں وزیر اعظم ہو سکتے ہیں۔ مگر الیکشن بالکل شفاف ہوئے، اور ایسے میں شریف آدمی کے جیتنے کی گنجائش کہاں۔ الیکشن سے کسی کو کوئی شکایت نہ تھی۔ ہارنے والوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور آزاد کشمیر کے تمام اخباروں نے بھی۔ پھر کچھ مسئلہ ہا کہ وزیر اعظم کون ہوگا، مگر یہ بھی حل ہو ہی گیا، اور سب نے قبول کیا۔

ہماری سپاہ کشمیر کے سرسبز پہاڑوں پر سرحدوں کی حفاظت میں لگی تھی۔ چونکہ ڈویژن کا پھیلاؤ بہت تھا اور زمینی راستوں سے جگہ جگہ پہنچنا ممکن نہ تھا، مجھے ایک چھوٹا سیل کا پرلا ہوا تھا۔ ہفتے میں تین روز اپنی سپاہ کے ساتھ گزارتا۔ صبح سویرے نکلتا اور مغرب سے پہلے واپس آتا۔ خوب صورت وادیوں میں اڑتا پھرتا، جہاں دل کرتا اتر جاتا۔ کشمیر کا کونہ کونہ دیکھ لیا۔

مری میں ڈویژن ہیڈ کوارٹر رکھنا مجھے پسند نہ آیا تھا۔ سارا ڈویژن کشمیر میں لگا تھا اور ڈویژن ہیڈ کوارٹر جہلم دریا کے پیچھے۔ اسپتال بھی یہیں اور بہت سے اور سیٹھے بھی۔ پھر گرمیوں میں سڑکوں پر اتار دیا ہوتا کہ کسی ایمر جنسی میں آگے کے علاقوں میں پہنچنے میں خاصی دشواری ہوتی، مری کے ارد گرد بھی حرکت مشکل ہوتی۔ اس ہی طرح رنجیوں کو پیچھے نکالنے کی بھی دشواریاں تھیں اور اگر جنگ کے دوران جہلم دریا کا پل تباہ کر دیا جاتا تو ہیڈ کوارٹر اپنی سپاہ سے کٹ کر رہ جاتا۔ مری میں تمام فوجی عمارتیں بھی نہایت بوسیدہ حال میں تھیں، جبکہ جس زمین پر وہ بنی ہوئی تھیں، وہ سونے کے مول تھی۔ میں نے

دریا کے پار ایک موزوں جگہ دیکھی اور جنرل مشرف کو تجویز دی کہ اگر ہم مری میں اپنی زمین فروخت کر دیں تو ایک بہتر جگہ پر مناسب طرز کا نیا ڈویژن ہیڈ کوارٹر تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر انہیں میری بات پسند نہ آئی۔

کشمیر میں رہتے ہوئے جنگی مشقیں بھی کروائیں۔ جارحانہ کارروائیوں کے نئے منصوبے بھی بنائے۔ جو پیسے فوج سے دفاعی پوزیشنیں بنانے کے لیے ملتے تھے، یقین کروایا کہ ان کا صحیح استعمال ہو۔ ناجائز چیزوں پر صرف نہ ہوں۔ نئی دفاعی پوزیشنیں بنوائیں۔ اگلے علاقوں میں سپاہیوں کے رہنے کی جگہوں کو اہمیت دی، بہتر کروائیں۔ مری میں گھومنے پھرنے کے لیے سپاہیوں اور ان کی فیملیوں کے لیے کوئی بندوبست نہیں تھا، اس پر کام شروع کر دیا کہ ان کو بھی یہ سہولیات میسر ہوں۔ بچوں کو لے کر آئیں تو سستی رہنے کی اور کھانے کی جگہ مل سکے۔ جس پلٹن کی پوسٹوں پر جاتا، وہاں پہرہ کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھا لیتا۔ پہلی مرتبہ جہاں گیا، ایک دعوت تھی۔ قریب قریب کے سب افسران کو بلوایا ہوا تھا، شاندار کھانے چنے تھے۔ میں نے تھوڑا سا کھا کر پلیٹ رکھ دی۔ کھاتا ہی کم ہوں۔ جب واپس آیا تو اسٹاف سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگے پونٹ کے لیے عزت کی بات ہوتی ہے کہ ڈویژن کمانڈران کے ساتھ کھانا کھائے۔ میں نے کہا یہ مناسب طریقہ نہیں، ان کو بتائیں ایسی دعوت نہ کیا کریں۔ اگر کوئی عزت دے تو بدتمیزی بھی اچھی نہیں لگتی، زیادہ کہا نہیں۔ اگلی مرتبہ کہیں اور گیا تو پھر یہی تماشہ ہوا جب واپسی پر اسٹاف سے پوچھا تو بتایا کہ تمام بریگیڈیئر کمانڈروں کو بتایا گیا تھا، پھر بھی یہی ہوا۔ پھر بریگیڈیئر کمانڈروں کی کانفرنس میں انہیں سمجھایا کہ یہ فوج کا طریقہ نہیں کہ سرکاری پیسوں پر سینئر افسران کی دعوتیں کی جائیں۔ کہنے لگے کہ اس طرح سے آپ کی ملاقات ارد گرد کے دوسرے افسران سے بھی ہو جاتی ہے۔ میں نے پوچھا اس دعوت کے پیسے کون بھرتا ہے، تو کہا کہ پونٹ کے فنڈ سے آتے ہیں۔ میں نے کہا فوری طور پر یہ سلسلہ بند کر دیں، لیکن شاید میرا بیٹھا انداز انہیں نہ بھایا۔ سلسلہ بند نہ ہوا۔ آخر مجھے ایک تکلیف دہ سرکاری خط لکھنا پڑا کہ کھانے پر ایک ڈش ہوگی اور پونٹ کے علاوہ کوئی باہر کا افسر نہیں آئے گا، تب جا کر میری جان چھوٹی۔ ایک مرتبہ سپاہیوں کی فیملیوں کی بھوادی تنظیم کا کوئی فنکشن تھا جس میں انجم مدعو تھیں۔ جب واپس آنے لگیں تو الوداع کہنے والی بریگیڈیئر صاحب کی بیگم نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے آہستہ سے کہا آپ! آپ کے لیے کچھ تحفے گاڑی کی ڈیگی میں رکھوا دیے ہیں۔ کافی خواتین وہاں کھڑی تھیں، آپا بے چاری شرمندگی سے کچھ بول نہ پائیں اور چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ آکر مجھے بتایا تو میں نے بریگیڈیئر صاحب کو فون کیا اور ڈانٹ پلائی، پھر کہا کہ اس بار تحفے واپس نہیں کر رہا تاکہ آپ کو سب کے سامنے شرمندگی نہ ہو، پیسے بھجوا رہا ہوں، اگلی مرتبہ محفل میں واپس کروں گا۔ بازار سے ان کی قیمت پتا کروا کے انہیں خاموشی سے لفافے میں پیسے ڈال کر بھجوا دیے۔ دوبارہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈویژن کے دو وار کورس کو الیفانڈ (War course) (qualified) بریگیڈیئروں کو میں نے ان کی پیشہ دارانہ کمزوریوں کی وجہ سے سالانہ رپورٹ میں ان فٹ فار پروموشن (unfit for promotion) قرار دیا۔ دونوں جنرل بننے کے قریب تھے اور اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ سینئر افسران کے بہت فون آئے، مگر میں نے کہا کہ رپورٹیں ایسی ہی رہیں گی۔ بعد میں جب لیفٹیننٹ جنرل ہوا تو ان کے پروموشن بورڈ میں بھی بیٹھا۔ ان کے لیے خوب زور ڈالا گیا مگر میں نے انہیں پروموشن نہ ملنے دی۔ اسی طرح ایک اور افسر کو، جو میرے قریبی جاننے والوں میں سے تھا، میں نے جنرل بننے کے لیے موزوں نہ سمجھا اور اس کی ہوتی ہوئی پروموشن روکوا دی۔ ان باتوں پر مجھ سے کافی لوگ ناراض ہوئے کہ تم اپنے جاننے والوں کی بجائے مدد کرنے کے، ان کی ”جنروں میں بیٹھ جاتے ہو۔“ میں آئندہ بھی ایسے ہی کرتا رہا اور لوگ ناراض ہوتے رہے۔ آج تک ہیں۔ مجھے مختلف ناموں سے بھی پکارا گیا مگر میں یونہی کرتا رہا کیونکہ فوج میں میرٹ پر سمجھوتہ کرنا، خاص کر اس عہدے پر، ملک اور قوم کے ساتھ عظیم ظلم ہے۔ میں جب تک طاقتور کرسی پر رہا، اللہ کے شکر سے کبھی فوج کے مفاد کو کسی اور ترجیح پر قربان نہیں کیا۔ نہ ہی اپنے اور نہ ہی کسی اور افسر کے لیے کوئی سفارش کی، چاہے اس کے کام کو صحیح ہی جانتا ہوں، نظام میں دخل نہیں دیا۔ اور نہ ہی کبھی کسی کی سنی۔ حالانکہ سفارش کا فوج میں بھی بہت رواج ہو چکا ہے۔ ان باتوں سے نہ صرف فوج کا نقصان ہوتا ہے، بلکہ حق داروں کی حق تلفی بھی۔ ایک مرتبہ جب میں CGS تھا، ایک میجر صاحب میرے پاس آئے، جن کی بیٹی کینسر کی مریضہ قریب المرگ تھی، مشین پر سانس چل رہی تھی۔ کہنے لگے کہ میری جدیلی کراچی ہو گئی ہے، کچھ دن کو روکادیں، میری بیٹی اللہ کو باری ہو جائے تو میں چلا جاؤں گا، کوئی میری سزا نہیں۔ ان کی جدیلی کچھ دن کو روکادی تھی۔ پھر شاید یہ ایک یادو ماہ بعد گئے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں۔ الحمد للہ۔ جب میں MO تھا تو یہاں یونٹوں کی نقل و حرکت کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ ایک نظام اور ایک دستور بنا ہے۔ ایک باقاعدہ لکھی ہوئی کتاب ہے، تاکہ یونٹوں کو باری باری اچھی چھاونی میں اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں رہنے کا موقع ملے۔ ایک لیفٹیننٹ جنرل صاحب کی یونٹ کئی مرتبہ ”ملاپ“ سے، اچھی چھاونیوں میں لگا تار رہ چکی تھی، میں نے اسے کسی دور کی چھوٹی چھاونی میں بھیجنے کے احکامات جاری کر دیے۔ پہلے تو ان کا فون آیا، میں نے انہیں اصول بتایا، کچھ ناراض ہوئے کہ میں ریٹائر ہونے والا ہوں اور آپ مجھے اصول بتا رہے ہیں، میری بات کا لحاظ کریں۔ کافی دباؤ والے انسان تھے اور مجھ سے خاصے سینئر۔ پھر انہوں نے SGS کو فون کیا، میں نے ان سے بھی یہی کہا کہ قانون کے مطابق یہ ہو نہیں سکتا۔ پھر جنرل صاحب نے جنرل مشرف کو خط لکھا کہ میری اتنی سروس کا کچھ لحاظ نہیں کیا جا رہا۔ میری ریٹائرمنٹ پر میری یونٹ نے ایک وردی اتارنے کی تقریب رکھی ہے، لیکن اگر فوج میں میری عزت نہیں اور میری آخری خواہش پوری نہیں کی جاسکتی تو میں یونٹ کی اس تقریب میں شرکت نہیں کر سکوں گا۔ یونٹ کے لوگوں کی مجھ سے کچھ توقعات ہیں، میں وہاں کیسے منہ دکھاؤں گا لکھا کہ مجھے امید ہے کہ میری بات کو آپ ضرور اہمیت دیں گے۔ جنرل مشرف نے یہ خط CGS کو مل کے لیے بھجوا دیا۔ انہوں نے مجھے خط دیا اور کہا کہ مشرف صاحب نے کہا ہے، اس کام کو کریں۔ میں نے خط فائل میں لگایا، اس پر نوٹ لکھا کہ یونٹ پچھلے کتنے برسوں سے کن کن اچھی چھاونیوں میں رہی ہے اور اب بھی اگر اسے اچھا اسٹیشن دیا جائے گا تو فوج میں یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہاں صرف سینئر افسران کی یونٹوں کا خیال رکھا جاتا ہے، باقی یونٹوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس سے فوج کے مورال پر بہت برا اثر پڑے گا۔ یہ لکھ کر نیچے لکھا کہ اپنے احکام سے آگاہ کریں۔ اور فائل اوپر بھیج دی۔ خالی دستخط ہو کر واپس آ گئی اور یونٹ دیئے ہوئے اسٹیشن پر ہی گئی۔ جنوری 2001ء میں مری ڈویژن کی کمانڈ پر آیا تھا۔ صرف آٹھ ماہ ہی یہاں رہ سکا، لیکن فوج کی تمام سروس میں اتنا لطف کسی اور کام میں نہیں آیا۔ ایک ہٹالین کی کمانڈ اور ایک ڈویژن کی فوج میں دو ہی کمانڈ ہیں جہاں آپ اپنی سپاہ کی براہ راست سربراہی کرتے ہیں اور ان کے اچھے اور برے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس کا ایک الگ ہی چمکا ہے، مگر مجھے تھوڑے ہی دن یہ موقع ملا۔ پھر ترقی ہو گئی، تو شکوہ بھی نہ کر پایا۔

مری آکر اس گھر میں رہے جس کو میں بچپن میں سڑک کے کنارے سے دیکھا کرتا تھا۔ سڑک سے صرف اونچی دیوار ہی نظر آتی تھی، لیکن ایک خاکہ سا ذہن میں تھا کہ مری کا جنرل یہاں رہتا ہے۔ شاید گھر کے چھپے ہوئے سے اس کا کچھ پراسرار سا تصور میرے ذہن میں بناتا تھا۔ آج میں اس میں رہ رہا

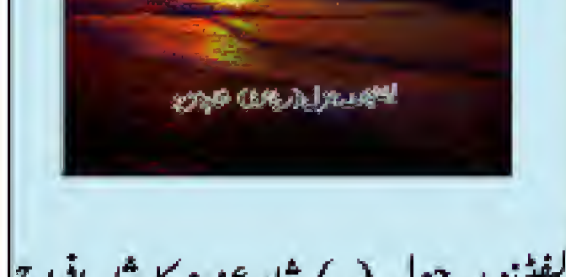
تھا۔ انگریزوں کے زمانے کا بنا گھر تھا، CMH کا CO رہا کرتا تھا۔ اونچی اونچی چیتیں، ہر طرف روشن دان، گرمیوں میں بھی خاصا ٹھنڈا ہوتا۔ گیٹ پر گاڑ کھڑی تھی اور پہلی مرتبہ پاکستان کا جھنڈا گھر پر لہرا رہا تھا۔ شام کو جب جھنڈا نیچے آتا، گاڑ سلائی دیتی تو سڑک پر چلنے والے رک جاتے۔ یہ منظر دیکھنے کا کافی لوگ ہر شام جمع ہوتے۔

گھر کے پچھلی طرف بہت بڑی وادی تھی، شام کو جنگلگانے لگتی۔ میں ہر شام سورج ڈھلنے پر یہاں آ جاتا، مکمل اوڑھے رات تک بیٹھا رہتا۔ جب جج کر کے آیا تو دل میں ایک سکون سا آ گیا۔ پہلی بار لیبیک پکارا تھا، یہ دل میں گھس بیٹھا تھا۔ کہے کے آگے بیٹھ کر سارا رونا روایا۔ خود کو دھوا آیا۔ پھر بھی ہر شام جب اس وادی میں ٹھٹھاتی بیتیاں ستاروں سے مل جاتیں تو گھنٹوں بیٹھا اپنے اندر غوطے کھاتا رہتا۔ (جاری ہے)



انریک کو جیکب آباد ایئر بیس دینے کی مخالفت کی تھی

ایم او کی میٹنگ میں کوئی افسر بھی فضائی اڈا دینے کے حق میں نہ تھا لیکن مشرف بولے میں امریکہ کو ہاں کر چکا ہوں۔ اس سے قبل افغانستان پر حملے کیلئے امریکی طیاروں کو بلوچستان کے اوپر سے گزرنے کی اجازت دی جا چکی تھی۔ امریکی احکامات کی تابعداری میں رکاوٹ بننے والوں کو سائیڈ لائن کر دیا جاتا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



ایک شام میری بیٹی سارہ نے کہا۔ ”جلدی ٹی وی دیکھیں، یہ کیا ہو رہا ہے“۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی ایک بلند و بالا عمارت سے ہوائی جہاز ٹکرا چکا تھا، دھواں نکل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور جہاز نمودار ہوا اور دوسری عمارت میں جا گھسا۔ سڑکوں پر ہنگامہ تھا۔ کچھ دیر میں دونوں ہی عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ اس وقت ہم سمجھے نہیں کہ مسلمانوں پر بھی سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک مہینے بعد اکتوبر کی 12 تاریخ کو، میں ترقی پاکر واپس GHQ میں CGS تعینات ہو گیا۔ واپس ملک کے مسائل میں جھوٹ کے بازار میں الجھنے۔

11 ستمبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ٹاورز گرنے کے بعد یونی پولر ورلڈ (unipolar world) کی حقیقتیں کھل کر دنیا کے سامنے آ گئیں۔ یہ واقعہ انتہائی مشکوک حالات میں رونما ہوا۔ امریکہ کے بہت سے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ یہ کام امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں اور یہودی تجزیہ کاروں کے گٹھ جوڑ سے رونما ہوا۔ وہ اس کے شواہد پیش کرتے ہیں۔ کسی بھی مجرمانہ کارروائی میں سب سے پہلے یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ اس کارروائی سے مستفید کون ہوا، اور 11/9 کے واقعے سے یقیناً یہودیوں کے عزائم کو، جن کا بیڑا امریکہ کی حکومت اور ان کے ساتھیوں نے اٹھایا ہوا ہے، تقویت ملی۔

یہ جیسے بھی ہوا، امریکہ کیلئے مسلم دنیا پر چھا جانے کا ٹریگر (trigger) بنا۔ دوسرے ہی دن جنرل کولن پاول (US Secretary of State, General Colin Poweell) نے جنرل مشرف کو فون کر کے کہا ”کیا آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے خلاف؟“ جنرل مشرف کی کتاب سے پتا چلا کہ انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ساتھ دینے کی کیا حدیں تھیں، نہیں لکھا۔ جس طرح بعد میں امریکہ کے احکامات کی ہم نے تابعداری کی، پتا لگا کہ ان حدوں کا تعین نہیں کیا گیا۔ کوئی معاہدہ نہیں تھا، جس سے حدود کا تعین ہو سکتا۔ جنرل مشرف بھی آہستہ آہستہ بات کو کھولتے رہے، جیسے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے گناہ کرواتے ہوئے بڑے گناہ کی طرف مائل کیا جائے۔ پھر جہاں رکاوٹ نظر آتی اسے یا تو دبا کر چپ کر دیا جاتا، یا ہٹا دیا جاتا، یا پھر اطلاعات اور احکامات کے دائرے سے باہر رکھا جاتا۔ اس کی صفائی بعد میں انہوں نے یوں پیش کی کہ کہہ دیا کہ سب کو بتانا لازم نہیں ہوتا، ضرورت کے مطابق (need to know basis) بتایا جاتا تھا۔ ایک زبانی سامعہ کی نظام چلتا رہا، جس کی حدیں آہستہ آہستہ بڑھاتی جاتیں اور ہمارے دشمن اپنے مقاصد حاصل کرتے رہتے۔ ہم ہاں کرتے رہے اور اس دلدل میں ڈوبتے رہے۔ حکومت محفوظ رہی اور پیسے آتے رہے۔

جب کورکمانڈر کانفرنس میں یہ مسئلہ اٹھا، میں مری میں تھا، ایک ماہ بعد GHQ آیا۔ تب تک اس موضوع پر تمام جھگڑے ٹٹائے جا چکے تھے۔ مجھے آنے پر پتا چلا کہ کورکمانڈروں کی کانفرنس میں کچھ کورکمانڈروں نے امریکہ کا ساتھ دینے کی مخالفت کی، کچھ نے جنرل مشرف کا ساتھ دیا اور زیادہ تر خاموش رہے۔ جنرل مشرف، مخالفت کرنے والوں پر ناراض ہوئے، پھر اپنا نکتہ نظر بیان کر کے بات ختم کر دی۔ خاموش رہنے والے ہاں میں شامل ہوئے۔ میں دُشوک سے نہیں کہہ سکتا کہ کیا باتیں ہوئیں، مگر لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کے مفاد میں نہیں کہ ہم امریکہ کے خلاف کھڑے ہوں، اور نہ ہی ہماری صلاحیت اتنی ہے۔ ہم نے اپنی معیشت کو تنہا ہی سے بچانا ہوگا، یہ تمام باتوں سے اہم ہے۔ ہندوستان امریکہ کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کا عندیہ دے چکا ہے، اور کہا ہے کہ آخر آپ کو پاکستان سے بھی تو نمٹنا ہے، ہندوستان سے کارروائیاں شروع کریں اور افغانستان اور پاکستان دونوں مسئلوں کو ایک باری لپیٹ لیں۔ کہا گیا کہ ہم اس لڑائی سے باہر ہیں گے۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں، اگر غلط فیصلہ کرتے تو ہماری انہی صلاحیت بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ یعنی جھوک کا جھوٹا خوف دلا کر، اپنی طاقت کو اپنی کمزوری ظاہر کیا۔

ملک میں بھی سوائے چند مجھے مجھے سے اختلافات کے، سب نے ہی ان کا ساتھ دیا۔ اسلامی تنظیموں کے علاوہ کوئی اور آواز نہ اٹھی، وہ بھی بس اس حد تک کہ لوگوں کی نظروں میں سرخوہو جائیں۔ ساری حکومتی مشین اس ہی پالیسی پر چل پڑی۔ زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ شرف صاحب کا فیصلہ درست تھا۔ آج بھی یہی سوچ نمایاں ہے۔

CGS کی کرسی پر لیفٹیننٹ جنرل عزیز کے بعد لیفٹیننٹ جنرل یوسف آگئے تھے۔ جب میں CGS آیا تو وہ جنرل بن کر وائس چیف کے عہدے پر فائز تھے۔ جنرل یوسف فرج میں سخت خوکمانڈر کے طور پر جانے جاتے تھے، مگر ایک سخت خول کے اندر ایک نہایت نرم دل انسان تھا، اللہ سے خوف کھانے والا۔ جب نیا CGS تعینات کرنا تھا تو چونکہ جنرل مشرف خود آئرلینڈ سے تھے اور نئے وائس چیف آئرلینڈ سے تھے، اس لیے انہیں مشورہ دیا گیا کہ کسی انٹرنی کے افسر کو لگانا مناسب ہوگا، ورنہ ان کے ذہن میں CGS کیلئے کسی اور کا نام تھا۔ اس وجہ سے مجھے، جنرل یوسف کے کہنے پر، آٹھ ماہ کی ڈویژن کی کمانڈ کے بعد ہی پروموشن دے کر یہاں لایا گیا۔ دو سال بعد جب میں یہاں سے فارغ ہو کر جا رہا تھا تو الوداعی چائے پر، جہاں GHQ کے اور بہت سے جنرل افسر آئے ہوئے تھے، جنرل یوسف نے میرے بارے میں کہا ”ان کی وجہ سے میرا کام نہایت آسان رہا، کیونکہ یہ تمام چیزوں پر خود ہی فیصلہ دے دیا کرتے تھے“۔ نہ جانے وہ ناراض تھے یا تعریف کی تھی۔

مجھے جنرل مشرف کے احکامات وائس چیف ہی کے ذریعے ملتے۔ میرے دو سال یہاں رہنے میں، ایک مرتبہ بھی CGS کے طور پر میری اپنے چیف سے اسکیلے میں ملاقات نہیں ہوئی۔ جب ملاقات ہوتی کسی میٹنگ میں ہوتی، جہاں کافی لوگ ہوتے۔ یا پھر کسی نجی محفل میں جہاں سرکاری بات نہ ہو سکتی۔ فوج کے دستور کے مطابق ایک اسٹاف افسر اپنے کمانڈر کی مخالفت، اس کے ماتحت کمانڈروں کی موجودگی میں نہیں کرتا۔ اگر کوئی اختلاف ہو تو علیحدگی میں اسے آگاہ کرتا ہے۔ شاید اس ہی وجہ سے مجھے مشرف صاحب سے یوں ملنے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

جنرل مشرف نے حکومت میں آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی فرقہ وارانہ تنظیموں پر سختی شروع کر دی تھی۔ یہ خوفناک گروہ ایران عراق کی جنگ کے دنوں سے پاکستان میں زور پکڑ چکے تھے۔ سعودی اور ایرانی پیسوں پر پلنے والی یہ تنظیمیں ملک میں نفرتوں کے بیج بویں اور فرقہ وارانہ فساد پیدا کرتیں۔ فساد پھیلانے کی خاطر عوام پر حملے بھی کرتے۔ ایک زمانے میں ایران کے شافعی مراکز بند کرنے کی تجویز بھی دی گئی تھی، لیکن پیپیڈیوں کے باعث اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ سعودی عرب سے چونکہ تیل کی صورت میں مالی امداد ملتی تھی، اس لیے ان کا زور زیادہ تھا۔ پچھلی حکومتوں نے، کچھ ان کے خوف سے اور کچھ ان کی پشت پر کھڑی طاقتوں کے دبدبے سے، دونوں اطراف کی تنظیموں پر ہلکا ہاتھ رکھا رہا۔ ان تنظیموں نے ملک میں بہت خرابی پھیلانی۔

پھر جنرل ضیا کے دور میں افغانستان اور کشمیر کی جہادی تنظیمیں وجود میں لائی جا چکی تھیں۔ یہ سب ہی اپنی طاقت مسجدوں اور مدرسوں سے حاصل کرتے، کیونکہ یہ اس وقت کی حکومت کی پالیسی تھی۔ عوام میں بھی جہادیوں کی خاصی قدر تھی۔ ان کا کام ہی اٹھایا تھا۔ افغانستان اور کشمیر کی بالکل علیحدہ جہاد تنظیمیں تھیں۔ گو کچھ رابطے ضرور رہتے، لیکن کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا۔ فرقہ وارانہ تنظیمیں اور مجاہدین، دو علیحدہ سلسلے تھے۔ ایک ہمارے ہیرو تھے اور دوسرے ناسور، مگر دونوں ہی مذہب کے زور پر چلتے۔

پھر جب 11/9 کا یونٹن لیا تو اچانک کل کے ہیرو آج کے دشمن بن گئے۔ غدار کہلائے۔ کشمیر کے مجاہدین تو کچھ نہ کچھ سنبھل ہی گئے، کیونکہ ان کا سلسلہ آہستہ آہستہ ختم کیا گیا۔ افغانستان میں ایک آزاد حکومت قائم تھی، جسے ہم نے تسلیم بھی کیا ہوا تھا۔ روس کے خلاف شروع کئے ہوئے جہاد میں افغانیوں اور القاعدہ کے علاوہ اور کئی ممالک کے باشندے بھی شامل تھے، جن سب کو ہمارا اور امریکہ کا تعاون حاصل تھا۔ پھر جب افغانستان سے سوویت یونین چلا گیا تو کوئی غیر ملکی مجاہدین پاکستان ہی میں رہ گئے۔ سینیں شادیاں کیں اور اپنے بچوں کے ساتھ رہتے رہے۔ اس کے علاوہ، لاکھوں افغان مہاجرین بھی یہاں رہتے تھے۔ ایک کھجڑی سی تھی، جو امریکہ کا حملہ شروع ہوتے ہی پھر سے اٹھ گئی۔

میرے یہاں آنے کے کچھ بعد MO میں ایک میٹنگ ہوئی، جس میں جنرل مشرف بھی آئے۔ MO میں ایسی ملاقاتوں پر وائس چیف، DGMI، DGMO، چیف کے اسٹاف افسر اور کچھ MO کا اسٹاف ہوتا۔ کبھی کبھار ضرورت پر، اوروں کو بلوا لیتے۔ جنرل مشرف نے صاف الفاظ میں کہا کہ ہم اس لڑائی میں غیر جانبدار نہیں گے۔ کہنے لگے کہ جب پاکستان اور ہندوستان کی لڑائی ہوتی ہے تو کوئی بھی ہمارا ساتھ دینے کھڑا نہیں ہوتا۔ اگر آج امریکہ افغانستان پر حملہ کر رہا ہے تو ہم اکیلے اس کا ساتھ کیسے دیں؟ اگر اور بھی مسلم ممالک اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں تو پھر ہم بھی مل کر ساتھ دے سکتے ہیں۔ کہا کہ ہم اس جنگ سے باہر ہیں گے، اس کا حصہ نہیں بنیں گے۔ ہم سب نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا۔

امریکی ہوائی جہازوں کو، افغانستان پر حملے کیلئے، بلوچستان کے اوپر سے گزرنے کی اجازت دی جا چکی تھی۔ کچھ دنوں بعد MO میں ایک اور میٹنگ ہوئی، جس میں جنرل مشرف نے کہا کہ امریکہ جیکب آباد کا ہوائی اڈہ استعمال کرنا چاہتا ہے، تاکہ اگر کسی ہوائی جہاز میں، کارروائی کے دوران، فنی خرابی ہو جائے تو ایمرجنسی لینڈنگ کر سکے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ہماری غیر جانبدارانہ پالیسی کے خلاف ہے۔ تو کہنے لگے نہیں میں تو انسانیت کی بنیادوں (humanitarian grounds) پر دینا چاہتا ہوں، صرف پائلٹ کی جان بچانے کیلئے۔ جب کوئی بھی ان کی طرف داری میں نہ بولا تو ناراض ہو گئے اور غصے سے کہا کہ میں ان کو ہاں کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

کچھ دنوں میں ان کے دفتر سے حکم ملا کہ جیکب آباد ہوائی اڈے کی حفاظت کیلئے کچھ سپاہ تعینات کر دیں۔ کونسل کی کور کو احکامات جاری کر دیے کہ ایک ہٹالین بھیج دیں۔ ہٹالین جب وہاں پہنچی تو وہاں پہلے سے امریکی فوج کے لوگ موجود تھے، جنہوں نے ہماری سپاہ کو ایئر پورٹ کے باہر ہی روک دیا اور کہا کہ اس جگہ کی حفاظت ہم خود کر رہے ہیں، آپ لوگ یہاں نہیں آ سکتے۔ آپ نے جو دفاع لگانی ہے وہ ہمارے حفاظتی حصار کے باہر رہتے ہوئے لگائیں۔ پھر ان کی سپاہ کے باہر رہتے ہوئے ہماری سپاہ نے حفاظتی پوزیشنیں اختیار کیں۔ کچھ عرصے بعد اس ہی ہٹالین سے پتا چلا کہ یہ اڈہ لگا تار جنگی ہوائی جہازوں کیلئے استعمال ہو رہا ہے، جن کی پروازیں رات دن جاری رہتی ہیں۔ یقیناً اس ہی مقدمے سے اڈا یا گیا تھا، پائلٹ کی جان بچانے کو نہیں۔ جب جنرل مشرف کو یہ بات بتائی گئی تو انہوں نے کہا کہ امریکہ نے لیا تو اس ہی غرض سے تھا، اب پتا نہیں وہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ بات کو یوں ٹال کر آگے بڑھ گئے، جیسے کوئی غیر اہم بات ہو۔

ہم آہستہ آہستہ اس جنگ میں پوری طرح سے امریکہ کے اتحادی بن گئے۔ افغانستان میں مسلمانوں کے قتل عام میں اسی طرح ملوث ہو گئے جیسے امریکہ کے باقی اتحادی۔ صرف ایک جھوٹ کا پردہ آنکھوں پر ڈال دیا گیا، جسے رفتہ رفتہ یہ رنگ دینا شروع کیا کہ یہ جنگ ہماری اپنی بقا کی جنگ ہے۔

جنرل یوسف امریکی جنگ میں شہولیت کے خلاف تھے

وائس چیف آف آرمی اسٹاف مشرف کی امریکہ نواز پالیسیوں سے پریشان رہے۔ گوادر پورٹ سے امریکی جنگی سازوسامان کی افغانستان تک ترسیل سے لاعلم رکھا گیا۔ اس وقت میں سی جی ایس تھا۔ کراچی سے نیو رسد لے جانے کا علم بھی اخبار سے ہوا۔ امریکہ کیساتھ گٹھ جوڑ پر اعتراضات کے سبب بے خبر رکھا جاتا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں

بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔



میں گوادر کے ساحل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شام کے ڈھلے سورج کی کرنیں پانی کے سکوت پر چمک رہی تھیں۔ ایک ریٹائرڈ میجر صاحب، جو گوادر پورٹ پر کام کرتے تھے، مجھے ملنے آئے، پاس بٹھالیا۔ مجھے بھی فوج سے ریٹائر ہوئے سال بھر ہو چکا تھا۔ NAB میں کام کر رہا تھا اور اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ باتوں باتوں میں میجر صاحب نے کہا ”سرا یہاں امریکنوں کی نیوی نے ساحل پر اترنے (amphibious landing) کی خاصی بڑی کارروائی کی تھی اور پانی کے جہازوں سے کافی جنگی سازوسامان اتارا تھا، پھر ان کی گاڑیاں، جوان جہازوں پر ہی آئی تھیں، یہ سامان لے کر افغانستان کی جانب چلی گئیں“۔ میں نے پوچھا ”یہ کب کی بات ہے؟“ تو جو وقت میجر صاحب نے بتایا، میں ان دنوں CGS تھا۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے کہا

”اگر ایسا ہوا ہوتا تو مجھے ضرور علم ہوتا“۔ کہنے لگے ”اگر میری بات کا یقین نہیں تو میرے ساتھ صبح چلیں، آج بھی وہاں ان کے نشانات موجود ہیں“۔ میں ان کے اصرار پر صبح ان کے ساتھ اس جگہ پہنچ گیا۔ یقیناً ساحل پر تمام نشانات موجود تھے، بکتر بند گاڑیوں کے بھی۔ دفاعی مورچے بھی کھدے تھے۔ میں دیکھ کر بہت حیران ہوا اور سوچا کہ کیا وہ تھی کہ فوج کے CGS سے یہ بات چھپائی گئی۔ کتنے ہی لوگوں کو تو خبر ہوگی، آخر مجھے کیوں نہ پتا چلا۔ یقیناً ISI اور MI دونوں کو اس کا علم ہوگا۔ MI کا ادارہ تو میرے نیچے ہی کام کرتا تھا، مگر ان دنوں کچھ نوعیت ایسی تھی کہ جو اجازت ہوتی وہی مجھ کو بتایا جاتا۔ پھر کوسٹ گارڈ (Coast Guard) جو فوجی کارروائیوں میں کراچی کے کور کے نیچے کام کرتی ہے، انہیں بھی یقیناً علم ہوگا اور کراچی کے کور کمانڈر کو بھی، فضا یہ اور نیوی کو بھی۔ لیکن CGS کو اس کی بھنک نہ لگنے دی گئی۔

واپس آیا تو پرانی نوٹ بک کھولی، صفحے پلٹے تو دیکھا، لکھا تھا ”امریکی فوج ارارہ یا جیوانی کے ساحل سے افغانستان کو ایک زمینی راستہ کھولنے کا سوچ رہی ہے“۔ کچھ آگے لکھا تھا 19 نومبر 2001ء، صدر صاحب کے دفتر سے بتایا گیا کہ پستی اور ارارہ کا علاقہ دیکھنے کیلئے امریکنوں کو اجازت دے دی گئی ہے۔ پھر اس علاقے میں دو یا تین امریکن میرینز (marines) بھی آئے جو نومبر کے آخر تک علاقہ دیکھ کر واپس چلے گئے۔ اس کا بھی اندراج ڈائری میں تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی اطلاع میرے پاس نہیں تھی۔ جنرل یوسف صاحب سے ملنے گیا، جوان دنوں وائس چیف ہوا کرتے تھے، اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ وہ بھی لاعلم تھے اور سن کر بہت حیران ہوئے۔ مجھ سے کیوں چھپایا گیا، کہہ نہیں سکتا۔ یہ بھی شاید ”need to know basis“ پر ہوا تھا۔

CGS فوج میں وہ منصب ہے، جسے فوج کی تمام کارروائیوں کی خبر ہونی لازم ہے، خاص کر اس نوعیت کی کارروائیاں۔ مگر ان دنوں، کیونکہ فوج میں امریکہ کے ساتھ اس گٹھ جوڑ پر بہت اعتراضات تھے، اس وجہ سے ”need to know basis“ پر کام کیا جا رہا تھا۔ ایک اور ایسا ہی قصہ یوں کھلا کہ میرے دفتر میں MI سے روزانہ اخباروں کی تمام اہم خبروں کے کلپ کردہ تراشوں کی فائل بھیجی جاتی تھی۔ ایک دن ایک خبر آئی کہ کراچی کے پرانے ایئر پورٹ کے نزدیک کوئی جھگڑا ہو گیا، جس میں کچھ فوجی بھی شامل تھے۔ میں نے اس خبر پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ اگلے دن اس کا جواب لکھا ہوا آیا تو پتا چلا کہ یہ سپاہی جن کا جھگڑا ہوا تھا NLC (National Logistic Cell) کے ڈرائیور تھے، جو یہاں پر قائم ایک امریکی دفتر کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ یہ دفتر کراچی پورٹ سے NLC کی گاڑیوں پر سامان ادا کر افغانستان پہنچانے کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ یہ کام فوج کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ میں نے QMG (Quarter Master General) کو فون کیا، جو GHQ میں بیٹھتے ہیں اور NLC ان ہی کے نیچے کام کرتی ہے، تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کی۔ اگر یہ خبر میں اخبار میں نہ پڑھتا اور اس پر سوالیہ نشان نہ لگاتا تو شاید یہ بات بھی میرے علم میں نہ آتی۔ ہماری فوج، امریکی فوج کی رسد لیے کراچی سے افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی اور CGS بے خبر تھا۔ جنرل مشرف سے جب بھی کوئی ایسی بات کہی جاتی، وہ گول مول کر کے ٹال دیتے۔ کہتے میں سب سمجھ رہا ہوں، جو پاکستان کے لیے بہتر ہے وہی کر رہا ہوں۔ آپ لوگ نہیں جانتے امریکہ کی حکومت کا کتنا دباؤ ہے اور ہم کس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میں تمام تصویر دیکھتا ہوں (I see the bigger picture) آپ کی نظر سارے معاملات پر نہیں ہوتی۔ سب کچھ ملک کیلئے ہی کر رہا ہوں۔ حالات کی پیچیدگیوں کو سمجھیں اور صرف جذباتی انداز میں چیزوں کو نہ دیکھیں۔ آج حقیقت پسندی کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک کبھی ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا۔ حوصلے اور تحمل سے کام لینا ہوگا۔ پھر میں چپ ہو جاتا۔ کبھی لگتا کہ شاید میں ہی جذبات میں بہک رہا ہوں، باقی سب تو ان ہی کے خیالات رکھتے ہیں۔ سارا ملک ہی۔ مگر اپنے آپ کو لاکھ سمجھانے پر بھی دل کو چین نہ آتا۔ نومبر 2001ء کے شروع میں MO سے پتا چلا کہ امریکی فوج کی ٹاسک فورس سورڈ (TF SWORD) کی کارروائیاں شمالی اتحاد کے ساتھ مل کر شروع ہیں اور وہ شمالی افغانستان سے کابل کی طرف پیش قدمی کریں گی۔ اس کارروائی کیلئے چیف ایگزیکٹو (Chief Executive-CE) کے دفتر سے امریکنوں کو شمش، ڈوب اور دالینڈین کی ایئر اسٹریپس (airstrips) کچھ عرصے کیلئے استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ امریکی CENTCOM کے نمائندے MO میں ارتباط کیلئے بھی آئے۔ یہ اور CIA کے نمائندے گاے بگاے MO میں آتے رہتے۔ مجھ سے بھی کبھی کبھار ملنے آتے۔ MO سے بتایا گیا کہ شمش پر ان کا میس ہوگا، جہاں جیٹ ایئر نیلڈ موجود تھی جو متحدہ عرب امارات کے کسی شہزادے نے شکار میں سہولت کیلئے بنوائی تھی۔ اگر ضرورت پڑی تو دالینڈین اور ڈوب کی ایئر اسٹریپس استعمال کی جائیں گی۔ ہمارے اندرونی خدشات اور لوگوں کی ناراضگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ ہوا کہ اگر دالینڈین اور ڈوب ایئر بیس میں استعمال بھی ہوئے تو صرف رات کو ہی ہوں گے۔ شمش پر، صرف اس آپریشن کیلئے چار C-130 جہاز اور بارہ ہیلی کاپٹر ہوں گے، جو طالبان کے سپلائی کے راستوں کو کاٹنے (interdict) میں استعمال ہوں گے۔ اسی مہینے یہ بھی پتا چلا کہ CIA کے ڈرونز (drones) شمش پہنچ چکے ہیں اور بیس رہیں گے۔ کہا گیا کہ یہ ویسے بھی ہمارا ہوائی اڈا نہیں ہے۔ یہ علاقہ ہم نے متحدہ عرب امارات کو طویل مدت کی لیز پر دیا ہوا ہے اور انہوں نے ہی یہ اڈا تعمیر کروایا ہے۔ ہمارا اس پر کوئی اختیار نہیں۔ ویسے بھی چونکہ یہ آبادی سے دور ہے لوگوں کی نظروں میں نہیں آئے گا۔ MO سے ملی ہوئی یہ خبریں میں نے جنرل یوسف کو بتائیں اور کہا کہ ہمارے لیے یہ باتیں، بہت پیچیدگیوں پیدا کر دیں گی۔ ہمیں اس طرح امریکہ کی جنگ میں ملوث نہیں ہونا چاہئے۔ انہوں نے امریکہ کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور ہماری مجبور یوں کا ذکر کیا اور کہا کہ جنرل مشرف بھی ان تمام چیزوں کی پیچیدگیوں سے واقف ہیں اور جو کم سے کم کر سکتے ہیں وہی کر رہے ہیں، حالات کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ جنرل یوسف خود بھی ان باتوں سے پریشان رہتے تھے اور امریکہ کے حق میں اس جنگ میں ہماری شمولیت کے حامی نہ تھے، مگر ہماری کمزوریوں کا بھی لحاظ تھا۔ امریکی فوج کے کابل پر قبضہ کرتے ہی ہندوستان کے بہت سے لوگ وہاں پہنچ گئے۔ یہ اپنے ساتھ ٹی وی، دی سی آر، اداکاروں کے نیم عریاں پوش رزاور اس ہی قسم کے اور مواد لے کر آئے اور فوراً ہی کابل ٹی وی اسٹیشن کی نشریات بھی شروع کر دیں۔ تمام سامان لوگوں میں اونے پونے داموں بانٹ دیا۔ یہ ان کا افغانستان میں پہلا قدم تھا۔ پھر آہستہ آہستہ حکومت کے ہر جھکے میں داخل ہوتے گئے، کہیں مشیر، کہیں تربیت دینے، کہیں محکموں کی تعمیر نو کی خاطر اور کہیں بہبود سواں کیلئے۔ ہم جھکے جو انہوں نے چنے وہ تھے: انصاف اور پولیس کا نظام، فوج کی تشکیل اور تربیت، دفتر خارجہ، تعلیمی نظام اور خفیہ ایجنسی۔ ان کی تمام تفصیلات ISI کے ذریعے ہمیں ملتی رہیں۔ (جاری ہے)

افغان طالبان کو پاکستان میں داخل آنے کے ذمہ دار امریکی تھے

انہیں تو رابورا سے دھکیل کر ہمارے ملک تک لایا گیا۔ ہمیں خبر ہونے تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ جنرل ٹومی فرینک سے شکایت کی تو انہوں نے کہا جنگ میں ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مشرف نے کہا ہمارے ملک سے امریکیوں پر حملے نہیں ہونے چاہئیں۔ لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



دسمبر 2001ء کے شروع میں فوج نے قبائلی علاقے میں پہلا قدم رکھا، وہاں کے لوگوں کے لئے ترقیاتی منصوبے شروع کرنے کے لیے۔ اسی دوران ہمیں یہ خبر دی گئی کہ افغانستان سے کچھ عرب جنگجو پاکستان میں داخل ہو سکتے ہیں، جس کا زیادہ خدشہ بلوچستان کے علاقے سے ہے۔ بارڈر پر بارہ جگہیں چین کے ارد گرد اور آٹھ پاراچنار کے علاقے میں ایسی تھیں جن پر فرنٹیر کور (FC) کے دستے تعینات کر دیئے گئے۔ پانچ

عرب مجاہدین چین سے گرفتار بھی ہوئے اور ISI نے بتایا کہ چین، ژوب اور چانگی کے علاقوں سے اور لوگوں کے آنے کا خطرہ ہے۔

CENTCOM کے کمانڈر جنرل ٹومی فرینکس جب پاکستان آتے، مجھے خوش آمدید کہنے ایئرپورٹ جانا پڑتا، عموماً تو اسلام آباد سے ہو کر واپس چلے جاتے اور میری صرف ایئرپورٹ پر سرسری سی ملاقات ہوتی۔ کبھی کبھار GHQ جنرل یوسف سے ملنے بھی آ جاتے۔ جب پہلی مرتبہ مجھے ایئرپورٹ جانے کا کہا گیا تو میں نے جنرل یوسف سے

کہا کہ میں بہت مصروف رہتا ہوں، GHQ میں کئی لیفٹیننٹ جنرل ہیں، کسی ایک کو یہ کام سونپ دیں۔ کہنے لگے، نہیں یہ ضروری ہے کہ آپ ہی انہیں لینے جائیں، ان کا فوج سے متعلق سارا کام آپ کے ہی نیچے آتا ہے۔

ایک مرتبہ جنرل مشرف MO آئے اور بتایا کہ امریکنوں کو خدشہ ہے کہ ہمارے علاقے میں جو غیر ملکی مجاہدین رہتے ہیں وہ بارڈر پارکر کے افغانستان میں نہ داخل ہو جائیں، ہمارے ملک سے امریکنوں پر حملہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں کچھ سپاہ کو Federally Administered Tribal Areas (FATA) میں بھیجا جائے۔ تاکہ وہ تمام غیر ملکیوں کو رجسٹر کر لیں۔ ہمیں پتا تو چلے کہ ہیں کتنے۔ میں نے کہا کہ اس میں افغان باشندے تو شامل نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ اس طرح کے غیر ملکی نہیں ہیں اور ان کو شامل کرنے میں بہت مسائل پیدا ہوں گے۔ انہوں نے کہا، نہیں افغانیوں کے علاوہ، دوسرے غیر ملکیوں کا حساب کتاب لگالیں، پھر سوچتے ہیں کہ کیسے یقین کیا جائے کہ یہ بارڈر پارکس نہیں جائیں گے۔ کیا ان کو کسی ایک جگہ اکٹھا کر لیں یا کچھ اور طریقہ کریں۔ پہلے تو اس بات کا تعین کر لیں کہ ہیں کتنے اور کہاں ہیں۔ اس کام کے لئے پشاور کے کور کو احکامات جاری کر دیئے گئے۔

غیر ملکی مجاہدین کے سلسلے میں جنرل ٹومی فرینکس بھی GHQ آئے۔ کہنے لگے۔ ”اپنے تالاب کو گر چھو (غیر ملکی مجاہدین) سے خالی کر لیں تاکہ آپ کی مچھلیاں (ہماری آبادی) سکون سے رہ سکیں۔ ہمارے اور آپ کے لیے یہ بہت اہم مسئلہ ہے، اس میں دونوں کا بہت نقصان ہو سکتا ہے۔“

امریکہ کی فوجیں شمال سے طالبان کو دھکیلتی ہوئی نیچے لے آئیں۔ پھر انہیں گھیر کر ہمارے بارڈر کے ساتھ تورا بورا (Tora Bora) کی پہاڑیوں کی طرف دھکیل دیا، اور اپنی کارروائیاں کچھ دنوں کے لئے روک رکھیں، تاکہ طالبان کی ہنگی کچھی سپاہ بھی یہیں پہنچ جائے۔ ان پہاڑوں میں غاروں کے کئی سلسلے بنے تھے جن سے امریکی بخوبی واقف تھے، کیونکہ سوویت یونین کے خلاف مجاہدین کو یہاں سے CIA اور ISI بھیجا کرتی تھیں۔ امریکی حکام کے مطابق اب اسامہ بن لادن اور القاعدہ کی تمام اعلیٰ قیادت اس علاقے میں تھی اور CIA کے پاس اس کی مکمل اطلاع موجود تھی، مگر انہیں گھیرے میں لینے اور پکڑنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ پاکستان میں داخل ہونے کے راستے اور مواقع فراہم کئے گئے۔

ہمیں کسی بات کی کوئی خبر نہ لگنے دی اور مگر چھ ڈھونڈنے کے کام پر لگے رکھا۔ جب تورا بورا پر گھیرا ٹنگ کیا اور امریکی لڑاکا طیاروں نے شدید بمباری سے ان غاروں کے سلسلے کو تباہ کرنا شروع کیا جہاں جہادیوں نے پناہ لی ہوئی تھی، تو یہاں سے بچے کچھے جہادی پاکستان میں داخل ہونے لگے۔ دسمبر 2001ء کے وسط میں خفیہ اداروں سے خبر ملی کہ کافی مجاہدین سرحد کے پار تورا بورا کے علاقے سے پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ پھر پشاور کی کور نے بھی اس کی تصدیق کی۔

18 دسمبر کو خبر ملی کہ جنرل ٹومی فرینکس کا CE کوفن آیا تھا کہ بارڈروں پر اپنی کارروائی کا ارتباط ہماری فوج سے کر لیں۔ اب کیا ارتباط ہو سکتا تھا، اس کا وقت تو گزر چکا تھا۔ دودھ بہہ چکا تھا، اب زمین ہی چاٹ سکتے تھے۔ فوری طور پر کچھ سپاہ کو بارڈروں کی جانب روانہ کیا گیا۔ یہ پہاڑی سلسلہ بہت اونچا تھا اور ان دنوں برف سے ڈھکا ہوا۔ پشاور کی کور کے پاس برفانی علاقوں میں کارروائیوں کے لئے کپڑے تنگ نہیں تھے، FC کے لوگ بے چارے شلوار قمیض اور چنپلوں میں ہی برف پوش پہاڑوں پر چڑھ دوڑے۔ FCNA گلگت کا سامان کچھ راولپنڈی اور کچھ گلگت سے منگوا یا، مگر ان تک پہنچنے پہنچنے کافی وقت صرف ہو گیا۔ جب تک سپاہ پہاڑوں پر صرف آراہوئی، تمام مجاہدین پہلے ہی بارڈر پار کر چکے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ FATA کے علاقے میں فوج کی تعداد بڑھتی رہی۔

قریب دو سو مجاہدین پاکستان کے اندرونی علاقوں سے حراست میں لئے گئے۔ وہ پکڑے بھی اس لئے گئے کہ ہم سے چھپ نہیں رہے تھے، سمجھتے تھے کہ ہم محفوظ مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ ان کو بسوں میں بٹھا کر جب پیچھے منتقل کیا جا رہا تھا تو ایک بس میں انہوں نے ڈرائیور اور گاڑ پر قابو پالیا اور بس سے اتر کر فرار ہو گئے۔ پھر ان کو ڈھونڈا گیا، باقی تو پکڑے گئے لیکن 6 غائب ہو گئے۔ نہ جانے اور کتنے تھے جو ہم سے چھپ گئے۔

جب اگلی ملاقات میں جنرل ٹومی فرینکس سے میں نے پوچھا کہ ہمیں کیوں نہ بتایا گیا کہ آپ کی فوج یہ کارروائی کرنے لگی ہے، تو معذرت سے کہا کہ کچھ ارتباط میں دیر ہو گئی۔ لڑائی میں ایسی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ بات کسی صورت مانی نہیں جاسکتی۔ لڑائیوں کے منصوبے اس طرح بغیر سوچے سمجھے نہیں بنائے جاتے۔ یہ تو ایک سوچی ہوئی تدبیر کے مطابق عین موقع پر ہمیں ڈائیورٹ (divert) کیا گیا، کہ ہم غیر ملکیوں کی گنتی میں لگ جائیں اور ہمارا دھیان دوسری طرف ہو جائے، تاکہ ان مجاہدین کو پاکستان میں دھکیلا جاسکے۔

افغانستان کے بعد کشمیر پر بھی یوٹرن لے لیا گیا

مشرف کشمیر سے زیادہ بھارت کیساتھ کاروباری مراسم بڑھانے پر زور دیتے۔ عوامی رد عمل کے خوف سے کھل کر موقف کا اظہار نہیں کیا۔ امریکہ کیخلاف باتیں سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ دہشت گردی کیخلاف جنگ کو پاکستان تک پھیلا نا امریکی سازش کا حصہ تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



افغانستان پر حملے کا منصوبہ صرف روایتی فوجی منطق پر نہیں بننا تھا۔ اس کے کچھ اور بھی مقاصد تھے، جو اس وقت نظر نہیں آتے تھے۔ طالبان کی فوج کا سارا رجحان شمال کی جانب تھا، ان کی سپاہ کا جھکاؤ بھی ادھر ہی تھا، کیونکہ وہ شمالی اتحاد (Northern Alliance) سے لڑ رہے تھے۔ جبکہ ان کی ساری سپلائی لائن پاکستان کی طرف سے جاتی تھی۔ امریکہ کی بھی ساری سپلائی لائن پاکستان سے جاتی تھی۔ یہیں ان کے اڈے بھی تھے۔ موزوں منصوبہ یہ ہوتا کہ شمال میں شمالی اتحاد سے مل کر طالبان کو اس غلط فہمی میں رکھتے کہ حملہ یہیں سے ہو گا۔ پھر حملہ پاکستان کی جانب سے کرتے۔ اس کے فوائد بہت تھے۔ یہاں سے کارروائیوں کیلئے زمینی راستے بھی آسان تھے، بہ نسبت شمالی راستوں کے۔ اگر پشاور کی جانب سے ایک اور چھوٹا حملہ کابل کی طرف بھی ہوتا، جو شمالی اتحاد کے حملے سے منسلک کیا جاتا تو طالبان کی ساری فوج ان ہی میں الجھ جاتی۔ پھر چین کی طرف سے بڑا حملہ کرتے، جہاں نسبتاً میدانی زمین اور سپاہ سے خالی علاقے ملتے۔ بلوچستان میں اتنی رکاوٹ بھی نہ تھی۔ حملہ شروع ہوتے ہی طالبان کی سپلائی لائنیں کٹ جاتیں اور وہ حملے کے اس ہتھوڑے اور شمالی اتحاد کے سندان (anvil) کے درمیان پس جاتے۔ کوئی ٹکٹ نہ پاتا۔ اور نہ ہی ہماری طرف سے کوئی قبائلی امداد شروع ہو سکتی۔ اس وقت قبائلی علاقوں میں اتنی مل چل بھی نہیں تھی۔ کچھ عرصے کیلئے امریکہ کی سپلائی کے راستوں کو محفوظ بنانا کوئی اتنا پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا۔ یہ کہہ دینا کہ پاکستان کی فوج رکاوٹ ڈالتی یا یہ کہ ان پر اتنا بھروسہ نہیں تھا، غلط ہے۔ جنرل مشرف ہر طرح کی امداد دینے پر راضی تھے اور فوج ان کے حکم پر کاربند۔ کیا کہیں کبھی کوئی رکاوٹ ملی؟ انہوں نے اوپر سے حملہ شروع کیا اور پھر ہمیں بھی اس سے آگاہ نہ کیا کہ جب حملے کا ہتھوڑا نیچے پہنچا تو کوئی سندان موجود نہ تھا اور سب کو دھکیل کر پاکستان میں پہنچا دیا۔

اتنی بڑی غلطی فوجی نہیں کرتا، جو ایک عام انسان کو بھی نظر آجائے۔ ایک آدمی تو منصوبہ نہیں بناتا، کتنے ہی لوگ اس میں شامل ہوں گے، کیا کسی کو یہ عام سی غلطی نظر نہیں آئی؟ اگر یہ غلطی تھی، پھر اس پر دوسری بھی ایک غلطی تھی کہ ہمیں تمام باتوں سے لاعلم رکھا گیا، جبکہ ان دونوں غلطیوں کا ایک ہی انجام ہوا، کہ سارے مجاہدین کو پاکستان میں محفوظ ٹھکانے ملے۔ یہ صرف ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا کہ پاکستان کو اس جنگ میں لپیٹ لیا جائے اور جنگ اس ڈھنگ سے کی جائے کہ پورے علاقے میں پھیل جائے اور لمبے عرصے تک جاری رہے۔ پھر آہستہ آہستہ پاکستان کو دباؤ میں لایا جائے۔ جنرل مشرف سے میں نے کہا کہ امریکی فوج نے ہمیں جان بوجھ کر اپنی کارروائیوں سے غافل رکھا، اور ہمارے لیے اتنی پیچیدگیاں پیدا کر دیں، ہم ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا کہ وہ ہمارے دوست کیسے ہو سکتے ہیں، جبکہ انہوں نے ہمارے واحد دشمن، ہندوستان کو ہماری پیٹھ کے پیچھے لا بیٹھایا ہے؟ نظر آتا ہے کہ ان کے عزائم ہمارے لیے خطرہ ہیں۔ وہ امریکنوں کے خلاف ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ مفروضوں پر تو ہم ملک کی پالیسیاں نہیں بنا سکتے اور نہ ہی سازشی قیاس آرائیوں (conspiracy theories) پر یقین کر کے ہم امریکہ کو اپنا دشمن سمجھ سکتے ہیں۔ جو سامنے نظر آ رہا ہے اسی کے مطابق ملک چلانا ہوگا۔ شاید ان کے دل میں بھی ایسے خدشات ہوں، مگر اس نازک وقت پر کہہ نہ سکتے ہوں اور نہ ہی کسی کو کہنے کی اجازت دے سکتے ہوں۔

26 جنوری 2002ء کو ہماری ایک پلٹن کے تقریباً پچاس لوگ، ان کے ساتھ ایک SSG کی ٹیم، بمعہ چار امریکنوں کے، مگر چھپوں کی تلاش میں ایک گھر پر پہنچے۔ خبر ملی تھی کہ یہاں غیر ملکی مجاہدین موجود ہیں۔ کئی بار ایسی خبریں ملتیں مگر کچھ نکل نہیں۔ جب گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک شخص نکلا۔ اس سے پوچھا کہ گھر میں کون کون ہے، تو اس نے کہا عورتیں اور بچے ہیں۔ کہا ہم تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ جواب دیا ”نہیں، عورتوں کو پردہ کرنے کا کہہ دوں“۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ پھر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد باہر نکلا اور کہا کہ اندر چلے جائیں۔ کچھ لوگ اندر داخل ہوئے۔ جب آگن میں پہنچے تو وہاں موجود لوگوں نے فائر کھول دیا۔ کچھ تو وہیں گر گئے اور کچھ، جو دروازے کے قریب تھے، باہر بھاگ آئے۔ اس تمام کارروائی کی ایک افسر نے کمرے سے ویڈیو بھی بنائی، جو بعد میں سب نے دیکھی۔ پھر سپاہیوں نے گھر کا گھیراؤ لیا۔ رات دس بجے تک دونوں جانب سے فائر ہوتا رہا۔ پھر خاموشی ہو گئی۔ فائر بند ہونے کے کچھ دیر بعد یہ غیر ملکی جنگجو گھر سے نکلے اور سپاہیوں کا گھیراؤ کرتے ہوئے کامیابی سے فرار ہو گئے۔ ایک سپاہی کی رائفل بھی ہاتھ سے چھین کر لے گئے۔ کوئی ہاتھ نہ آیا۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ فوج اور مجاہدین میں براہ راست فائر کا تبادلہ ہوا۔ اس واقعے کی باقاعدہ انکوائری ہوئی اور کئی افسران کو سزا ملی۔ اس کے بعد فوج اور زیادہ محتاط ہو گئی اور فائر کرنے میں پہل کارجہان آنے لگا۔ گاہے بگاہے کہیں نہ کہیں فائر کا تبادلہ ہوتا رہتا۔ SSG کا پہلا آپریشن بھی اسی نوعیت کا رہا۔ کچھ غیر ملکی مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا گیا، پھر انہیں میگافون کے ذریعے بہت سمجھایا کہ ہتھیار ڈال دیں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا، مگر وہ صرف گولیوں سے جواب دیتے۔ آخر دم تک مجاہدین لڑتے رہے اور سب نے جان دے دی۔ ایک نے بھی ہتھیار نہ پھینکا۔ آخری زخمی لمبی گھاس میں چھپ گیا۔ SSG کے گھیرے میں پھنسا، گاہے بگاہے رات تک فائر کرتا رہا۔ صبح اس کی لاش ملی۔

13 دسمبر 2001 کو ہندوستان کی پارلیمنٹ بلڈنگ پر ایک مسلح گروہ نے حملہ کیا، اور ہم کو اس حملے کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ پھر ہندوستان نے اپنی فوجیں ہمارے بارڈروں پر لگانی شروع کر دیں۔ ہمیں بھی دفاعی اقدام لینے پڑے۔ جنگ کا ڈنکا بجایا گیا۔ قوم کو بتایا گیا کہ سب میرے جھنڈے تلے اکٹھے ہو جاؤ، پاکستان کو خطرہ ہے، کسی وقت بھی جنگ ہو سکتی ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ اس سے ایک ہی دن پہلے ملک کے چیف ایگزیکٹو نے ایک کانفرنس میں بتایا تھا کہ امریکہ کا کہنا ہے کہ ISI میں نچلے طبقوں میں اب بھی مجاہدین کی طرف داری کے اثرات موجود ہیں۔ دوسرے دن مجاہدین کی کارروائی ہو گئی۔ حکم دیا کہ جن لوگوں میں یہ رجحان نظر آئے انہیں فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ جنرل مشرف نے کہا کہ ہم کسی بھی صورت اپنی سرزمین کو ”دہشت گردی“ کیلئے استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بات وہ اس سے پہلے بھی کہہ چکے تھے۔ کشمیری مجاہدین بھی دہشت گرد قرار پا چکے تھے۔ جہاد بند کر دیا گیا تھا اور فوج کو بھی یہی حکم تھا کہ کوئی بارڈر کے پار نہ جانے پائے۔ یہ سب پہلے ہی ہو چکا تھا، لیکن کھل کر عوام کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کیا گیا تھا، تاکہ لوگ مشتعل نہ ہوں۔ اب تک کشمیر کی جہادی تنظیمیں برقرار تھیں، مگر ان کو آہستہ آہستہ لیپنا جا رہا تھا۔ افغانستان پر یوٹرن کے بعد، اتنی جلدی کشمیر کے جہاد سے ہاتھ اٹھانے پر حکمران کو عوام سے خوف آتا تھا، مگر کام جاری تھا۔

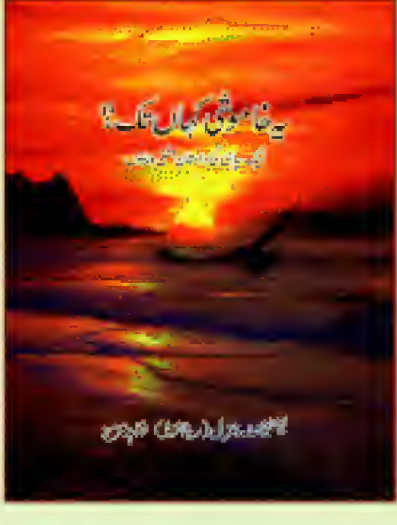
دہلی میں دھماکے کے بعد ہم دنیا کی نظروں میں مجرم بنے کہ اب تک دہشت گرد تنظیموں کی امداد کرتے ہیں۔ یہ بے بنیاد الزام جرم تھا۔ اس وقت تک پاکستان کشمیریوں کے جہاد کیلئے امداد بند کر چکا تھا اور امریکہ کو یقین دلا چکا تھا کہ آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے، کشمیری مجاہدین کا کوئی ایک منظم گروہ تو تھا نہیں، کچھ نہ کچھ سرچھڑے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے، اللہ کی راہ میں میں نکلے تھے، کسی کی کیوں سنتے۔ لیکن حکومت ہرگز اس میں ملوث نہیں تھی۔ پھر یہ دھماکے کرنا صرف مجاہدین کا ہی کام تو نہیں۔

16 دسمبر کو چاند رات تھی۔ جنرل مشرف کے گھر ایک میٹنگ بلوائی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ امریکی سفیر نے ایک ڈیمارش (demarche) پیش کیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ لشکر طیبہ اور جیش محمد کیخلاف سخت کارروائی کی جائے، حزب المجاہدین کو بھی روکا جائے۔ ان تمام دہشت گرد تنظیموں کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ انہوں نے پڑھ کر سنایا۔ لکھا تھا کہ لشکر طیبہ اور جیش محمد امریکہ کے مفاد کو خطرہ ہیں اور یہ تنظیمیں جلد UNO کی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گی۔ پاکستان کے مفاد میں ہے کہ اس سے پہلے ان کیخلاف کارروائی کر لے۔ ابھی تک امریکہ نے پاکستان سے یہ مطالبات سرعام نہیں کئے ہیں، کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کیلئے دھواں دھواں نہ پیدا کریں۔ ڈیمارش میں مطالبہ کیا گیا کہ آزاد کشمیر میں تمام دہشت گرد و ترغیبی کیمپ فوری بند کر دیے جائیں، ان کے اثاثے منجمد کئے جائیں اور اہم شخصیات کو قید کر دیا جائے۔

ڈیمارش پڑھ کر سنانے کے بعد جنرل مشرف نے کہا کہ ہم کسی صورت اپنی سرزمین کو دہشت گردی کیلئے استعمال نہیں ہونے دیں گے مگر کشمیر کی جنگ آزادی دہشت گردی نہیں ہے۔ ہم آہستہ آہستہ ان تنظیموں کو بند کریں گے۔ کہنے لگے، پہلے ہندوستان کو یہ قبول کرنا ہوگا کہ کشمیر ہی ہمارا اصل مسئلہ ہے اور ہم سے معنی خیز مذاکرات شروع کرنے ہوں گے۔ خارجہ سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ امریکہ دہشت گرد اور فریڈم فائٹرز میں فرق نہیں کرتا۔ اس سلسلے کی ہر میٹنگ میں دفتر خارجہ کا موقف واضح ہوتا۔ وہ امریکہ اور بھارت سے تعلقات بڑھانا چاہتے اور جہادی رجحان کی مخالفت کرتے۔ کشمیر کی جنگ آزادی کے سخت خلاف تھے اور کشمیر کے مسئلے کو پیچھے رکھتے ہوئے، بھارت سے کاروباری مراسم بڑھانے پر زور دیتے۔ جنرل مشرف کا بھی یہی کلیہ نظر ہوتا، مگر کھل کر نہ کہتے۔ (جاری ہے)

مشرف نے امریکی بااوپر کشمیری مجاہدین کی امداد بند کی تھی

بھارت سے جنگ کا خطرہ پیدا کر کے قوم کو امریکہ نواز پالیسی پر رضا مند کیا گیا۔ امریکی پاکستان کو دہشت گردی کا مرکز قرار دینے میں کامیاب رہے۔ بھارت کو خطے کی بڑی طاقت کے طور پر منوانا بھی ہدف میں شامل تھا۔ اسی لئے کشمیر کی جنگ آزادی دہشت گردی قرار پائی۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز



میں نے جنرل مشرف سے ایک مرتبہ کہا کہ جب کشمیر پر ہمارا موقف درست ہے اور اس پر UNO کی قراردادیں بھی موجود ہیں تو ہم اسے دہشت گردی سے کیوں ملاتے ہیں؟ ہمارا مطالبہ ہونا چاہئے کہ اگر



ہندوستان کشمیریوں کو سیاسی آزادی کا حق دیتا ہے، تو ہم بھی مجاہدین کو روک لیں گے۔ کشمیریوں کا حق دنیا نے قبول کیا ہے۔ اگر انہیں سیاست میں بھی آزادی نہیں اور آواز بھی بلند نہیں کر سکتے تو پھر ان کے پاس لڑنے کے سوا چار ایسی کیا ہے۔ کشمیر میں تو میڈیا اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو بھی جانے کی آزادی نہیں۔ کہنے لگے درست ہے، مگر دنیا اس وقت صرف دہشت گردی کے خلاف متحد ہے اور نان اسٹیٹ ایکٹرز (non state actors) کی فوجی کارروائیاں دہشت گردی کہلاتی ہیں۔ کوئی یہ بات سننے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔

پھر میں نے مشورہ دیا کہ اگر تمام کشمیری مجاہدین کو گھر بھیج دیا جائے تو ہماری یہ صلاحیت ختم ہو جائے گی، نہ جانے کل حالات کیسے ہوں۔ یہ بھی خدشہ رہے گا کہ وہ کسی اور تحریشی کاررائیوں میں ملوث ہو جائیں اور ہمارے لئے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دیں، انہیں لڑنے کے سوا آٹا ہی کیا ہے۔ امریکہ کو نان اسٹیٹ ایکٹرز سے اختلاف ہے، تو ہم انہیں بھرتی کر لیتے ہیں اور ان کی مجاہدین بنالین بنا لیتے ہیں۔ انہیں کشمیر سے دور کسی جگہ تربیت کیلئے رکھ لیتے ہیں۔ ان کی خدمت کے صلے میں ان کی روزی بھی جاری رہے گی، ہمارے قابو میں بھی رہیں گے اور ہماری صلاحیت بھی برقرار رہے گی۔ ہماری فوج میں نیم فوجی مجاہد بنالین پہلے سے بھی موجود ہیں، کوئی نئی چیز نہیں۔ آخر ساری بڑی بڑی افواج میں اسٹیشن فورسز (مخصوص نوعیت کی سپاہ) ہوتی ہیں، یہ بھی ایک قسم کی اسٹیشن فورس ہوگی۔ کہنے لگے نہیں یہ آج کل کے حالات میں ہم نہیں کر سکتے۔

آہستہ آہستہ بارڈر پر ہندوستان کی فوجی صلاحیت بڑھتی جا رہی تھی۔ دفاعی اقدام لینا لازم تھا۔ فوج کا اصول ہے کہ دشمن کی صلاحیت کا جواب دیا جائے، چاہے اس کا ارادہ نظر نہ آتا ہو، کیونکہ ارادہ تو کبھی بھی بدل سکتا ہے۔ لیکن ایک اور چیز جو ذہن میں رکھنی چاہئے وہ یہ کہ اگر آپ اس کا ارادہ صحیح طرح نہ بھانپ سکیں تو اس دھمکی اور دباؤ کے کھیل میں، جو ابھی چل رہا تھا، نقصان اٹھا سکتے ہیں۔

حقیقت میں جنگ کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس فوجی دباؤ کے مقاصد اور تھے۔ البتہ اس مرتبہ کارگل کے تجربے کے بعد ان کی فوجی صف آرائی کا ڈھونگ کھل گیا تھا۔ انہوں نے تقریباً پوری فوج بارڈر پر لگا دی۔ بارودی سرنگیں بھی بچھائیں، تاکہ جھوٹ چھپ سکے۔ مگر جنگ کا خدشہ صرف مکا دکھانے سے نہیں پیدا ہوتا۔ جنگ کے کچھ حالات ہوتے ہیں اور کچھ مقاصد۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو کافی حد تک دیکھا جاسکتا ہے کہ آیا جنگ ہی دشمن کے مفاد میں ہے یا فوجی دباؤ کے کچھ اور مقاصد بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ دہشت گردی کے خلاف پاکستان اور امریکہ کا تعاون جاری تھا۔ پاکستان امریکہ کی ہر فرمائش پوری کرنے پر آمادہ تھا، اور کر رہا تھا۔ کشمیر کے جہاد کی امداد امریکہ کے ہی دباؤ پر ختم کی گئی تھی۔ اس میں بھارت کا براہ راست کوئی کردار نہیں تھا۔ پھر بھارت مجاہدین کا دباؤ سالہا سال سے برداشت کر رہا تھا، کوئی نیا کھیل نہیں تھا، اور اب تو بند بھی کر دیا گیا تھا۔ اگر خدشہ تھا کہ پاکستان کشمیری مجاہدین کے سلسلے میں دھوکہ دے رہا ہے، تو امریکہ کافی تھا اس کی گردن مروڑنے کو۔ امریکہ کا دباؤ بہت کارگر تھا۔ اور جو مقصد جنگ کے بغیر حل ہو سکتا ہو اس کے لئے کون نامعقول دوا بیٹی ملکوں کو جنگ میں دھکیلے گا؟ یہ جنگ کیلئے معقول وجہ (sufficient cause) نہیں تھی۔

اگر بھارت جنگ شروع کر دیتا تو لامحالہ ہمیں مغربی سرحدوں سے تمام افواج اٹھا کر بھارت کے بارڈر پر لے جانی پڑتیں۔ فوج بھی اور FC بھی۔ پاکستان کی سرزمین سے افغان مجاہدین کی امداد کون روکتا؟ اور بھارت سے کامیاب جنگ کرنے کیلئے مجاہدین ایک بار پھر ہمارے بھائی بن جاتے۔ کشمیر کا جہاد پھر جائز ہو جاتا۔ بمشکل تو امریکہ کے دباؤ سے انہیں مجاہد کر رہے تھے۔ اگر کرملیون کیا تھا۔ تو جس بلا کو ختم کرنے ہندوستان اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ جنگ کے نتیجے میں اور بڑی ہو جاتی۔ کیا حاصل ہوتا؟ اور پھر ابھی تو پاکستان عوام کا دل مغربی تہذیب کی طرف مائل کرنا ہی شروع کیا تھا، وہ پھر سے اللہ اکبر کے نعرے لگانے لگتے۔

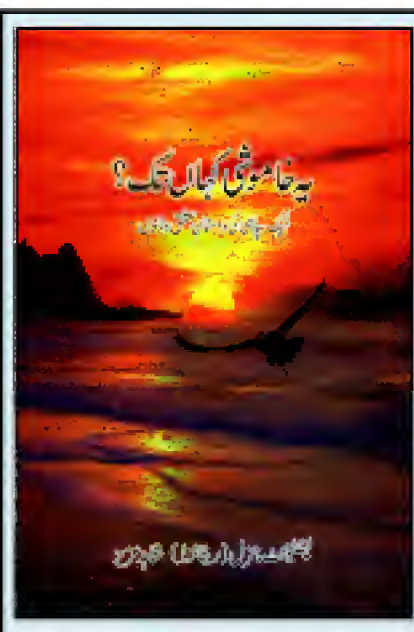
تو ایسے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی دہشت گردی کے خلاف جنگ پر کیا اثرات نکلتے؟ کیا امریکہ کو یہ قبول ہو سکتا تھا؟ کیا بھارت امریکہ اور اس کے ساتھیوں کے کھیل کو تباہ کر کے اور ان کو ناراض کر کے کامیابی حاصل کر سکتا تھا؟ اس کی اٹھتی ہوئی معیشت کا کیا ہوتا؟ وہ کام جو امریکہ خود ہی، بغیر معاوضہ کے کر رہا تھا، اس کیلئے جنگ کا خطرہ مول لے کر اتنا بڑا فائدہ اپنے لئے اور دنیا کیلئے کیونکر کھڑا کر سکتا تھا، جس میں کچھ حاصل ہونے کے بجائے انجام الٹا ہی نکلتا۔

بھارت نے تو شروع دن سے ہی امریکہ کو کہا تھا کہ آپ یہاں آئیں اور کھیل یہاں سے شروع کریں، تاکہ وہ اس کھیل کا حصہ ہو۔ 1971ء کے بعد اب بھایا پاکستان کا بھی صفایا کیا جائے، اور بھارت اس خطے کی واحد بڑی طاقت بن کر ابھر سکے۔ یہ چونکہ ہونہ سکا، اب وہ اس کھیل میں کودنا چاہ رہا تھا کہ دنیا کو باور کرائے کہ اس خطے میں بھارت ہی بڑی طاقت ہے اور یہاں جو کچھ بھی ہوگا بھارت کی شمولیت سے ہی ہوگا۔ اور پاکستان کو دونوں طرف سے گھیرے میں رکھ کر دنیا کو یہ بھی دکھائے کہ اس کے ہوتے ہوئے پاکستان کی کیا مجال کہ امریکہ کا کھل کر ساتھ نہ دے! وہ پاکستان کو مجبور کرے گا کہ اس جنگ میں امریکہ سے بھرپور تعاون کرے۔ دنیا کو پتہ ہوگا کہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں بھارت ایک بڑا کھلاڑی ہے۔ اس طرح پاکستان کے خلاف اس کھیل میں بھارت نے خود کو جھے دار بنایا، اور خطے میں بڑی طاقت کے طور پر اپنا ہونا مانوایا۔ دوسرا ہدف یہ تھا کہ دنیا کھل کر اس بات کو تسلیم کرے کہ کشمیر کی جنگ آزادی دہشت گردی ہے، اور یہ کہ بھارت عرصہ دراز سے پاکستان کے ہاتھوں اس ظلم کا سامنا کر رہا ہے۔ اب تک دنیا کشمیری مجاہدین کی کارروائیوں پر خاموش تھی اور بھارت کے موقف کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بحث چل رہی تھی کہ جنگ آزادی اور دہشت گردی میں کیسے تفریق کی جائے، حتیٰ کہ دہشت گردی کی تعریف پر ہی اتفاق نہیں تھا۔ سالہا سال سے بھارت اس جہاد کے خلاف دنیا کے آگے کھل کر آواز نہیں اٹھا سکتا تھا۔ خود جو مجرم تھا، چھنسا ہوا تھا۔ جو ظلم وہ آزادی کی اس جدوجہد پر ڈھا رہا تھا، جسے تاریخ کی روشنی میں دنیا جائز سمجھتی تھی۔ 11/9 کے بعد اب دنیا میں وہ ظلم جائز اور آزادی کی جدوجہد ناجائز سمجھی جانے لگی۔ اب کشمیر کا مسئلہ بھی ختم ہوا۔ اب صرف اس کی باتیں ہی کر سکتے ہیں۔ اس راہ پر چلتے چلتے، آج پاکستان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں سوائے اس کے کہ کشمیر پر زبانی جمع خرچ کرتا رہے، جس کا نہ کوئی حاصل، نہ وصول۔ امریکہ کے کھیل میں بھی بھارت کی فوج کشی موزوں تھی، کہ خطے میں جنگ کے بادل دکھائے جائیں، اور یہ چال ان کی مرضی کے بغیر وقوع پذیر ہو نہیں سکتی تھی۔ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے خدشے سے دنیا گھبراتی ہے۔ کارگل کے بعد پاکستان سے لوگ اور بھی خائف تھے، اور وہاں بھی ہم نے مجاہدین کا ہی جھوٹا کھیل کھیلا تھا۔ پھر اب پاکستان کو اس رنگ میں بھی دکھانا تھا کہ دنیا میں دہشت گردی کا یہی خطرناک گڑھ ہے، جس نے سب کی ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ اور یہ اسٹی طاقت ہے، جس کی موجودہ حالت اور رجحانات کے خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ بھارت کو ساتھ ملائے بغیر یہ سب نہیں ہو سکتا تھا، اور ملنا یوں بھی لازم تھا کہ اس خطے میں آئندہ کے تمام کھیلوں میں یہی امریکہ کا ساتھ دے سکتا تھا۔ شروع سے ہی بڑی تعداد میں انہیں افغانستان میں داخل کر لیا گیا تھا۔ انڈیا کی جنوبی ایشیا کے تیل اور گیس کے ذخائر پر قبضہ کرنے اور چین کی ابھرتی ہوئی طاقت اور اس کا روس سے الحاق روکنے کیلئے امریکہ کا بڑا منصوبہ ساز ساتھی (strategic partner) بننے کا اہل ہو سکتا تھا۔ پھر امریکہ کا ساتھ دینے پر پاکستان کے عوام کی چوں چاں بھی اس جنگ کے خطرے سے بند ہوئی۔ ہماری حکومت کیلئے بھی یہی قرین مصلحت تھا، چونکہ اس وقت جب کہ امریکہ کا ساتھ دینے پر قوم میں کافی تحفظات تھے، اس جنگ کے خطرے کی تصویر سے قوم کو امریکہ نواز پالیسی کے پیچھے اکٹھا کرنے میں مدد ملی۔ جنگ کا یہ دباؤ ہماری عوام پر تھا، تاکہ اس گھبراہٹ میں سب ہی حکومت کے پیچھے کھڑے ہو جائیں، حکمران کے ہاتھ مضبوط ہوں اور مجاہدین کے خلاف کھل کر کارروائیاں کی جاسکیں۔ جنرل مشرف کیلئے یہ ایک تحفہ ثابت ہوا۔ جنگ کے خدشے سے لوگوں نے اور بہت کچھ نظر انداز کر دیا اور مشرف صاحب ایک مدبر کی حیثیت سے ابھرے، جنہوں نے اس دوہرے خطرے کے درمیان سے ملک کو بچا کر نکالا۔ تینوں فریق ہی اس صف آرائی سے مستفید ہوئے۔ (جاری ہے)



مُشرف نے کشمیر پر بھارت کو دباؤ میں لینے کا موقع ضائع کر دیا

دسمبر 2001ء میں کشمیر پر حملے کا خدشہ تھا۔ بھارت کو برابر کا جواب دینے کی میری تجویز نہ صرف مسترد کر دی گئی بلکہ نولانا مسعود اظہر اور جمیش محمد پر پابندی لگانے کا حکم دیدیا گیا۔ اپنے مطالبات منوا کر بھارت نے کشمیر سے فوج واپس بلائی تو مشرف نے اسے اپنی ”جیت“ قرار دیا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے

کُل جنگ کا خطرہ تو نہ تھا، مگر کچھ نہ کچھ muscle flexing کی گنجائش ضرورت تھی۔ ان دنوں اس سلسلے میں کئی میٹنگز ہوئیں۔ 24 دسمبر 2001ء کو جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی (JCSC) کی میٹنگ ہوئی۔ تجزیہ تھا کہ بھارت کشمیر میں محدود کارروائی کر سکتا ہے، اور زیادہ خدشہ صرف فضائی حملے کا ہے۔ کسی جگہ حملہ کر کے کہہ سکتا ہے کہ ہم نے مجاہدین کے تربیتی کیمپ پر حملہ کیا ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ امریکہ ہندوستان کو کشمیر کے

علاقے میں مظاہرے کے طور پر تعزیری کارروائی (demonstrative punitive strike) سے نہیں روکے گا، مگر صرف کشمیر میں فضائی حملہ بھارت کیلئے فوجی لحاظ سے سودمند نہیں تھا۔ محدود کارروائی میں پاکستان کے جواب برابر کے ہو سکتے تھے۔ اس لئے باز رہا۔

پھر اسی رات CE نے ایک اور میٹنگ بلوائی، جس میں خارجہ امور کے وزیر نے بتایا کہ امریکہ اور برطانیہ نے کہا کہ اس کے پاس ثبوت موجود ہیں کہ لشکر طیبہ اور جمیش محمد ہندوستان میں ISI کی مدد سے دہشت گردی کر رہے ہیں، اور ان دونوں کا بہت دباؤ ہے کہ ہم ان تنظیموں کے خلاف کارروائی کریں۔ خارجہ سیکریٹری صاحب نے کہا کہ جب تک ہم کچھ کرتے نہیں، تمام مغربی ممالک ہم پر دباؤ بڑھاتے رہیں گے، چاہے ثبوت ہو یا نہ ہو۔ CE صاحب نے احکام دیئے کہ اظہر مسعود کو قید کر دیا جائے اور جمیش محمد کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

میرا نکتہ نظر تھا کہ یہ ظاہر کر دیا جائے کہ کشمیر افغانستان نہیں ہے، اور یہاں آزادی کی جدوجہد ہو رہی ہے، دہشت گردی نہیں۔ میری سوچ تھی کہ آج پاکستان دنیا کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں نہایت اہم کردار رکھتا ہے، ابھی امریکہ نے افغانستان میں قدم رکھا ہی ہے، اسے ہماری بہت ضرورت ہے۔ ہم اس میں سے کچھ تو اپنا فائدہ نکالیں۔ اگر ہم ہندوستان کے دباؤ کے آگے کشمیر پر اپنے موقف سے ہٹ گئے تو کشمیر کا معاملہ ہمیشہ کیلئے لپیٹ دیا جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اگر بھارت کشمیر میں محدود جنگ کا آغاز کرتا ہے، تو ہم شروع میں تو اس کی کارروائیوں کا برابر کا جواب دیں۔ پھر مجاہدین کی کارروائیوں میں ایک دم اضافہ کر دیں اور معاملے کو اس حد تک بڑھادیں کہ اس کا حل کرنا ناگزیر ہو جائے۔

میرا خیال تھا کہ یہی موقع ہے کہ دنیا کو کشمیر کا مسئلہ حل کرانے کیلئے دباؤ میں لایا جاسکتا ہے۔ اگر بھارت ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے تو ہمیں اس کا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ جنگ کا یہ ڈھونگ نقلی ہے اور درجن کے بجائے ان حالات کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہئے۔ دہشت گردی ختم کرنے کا جو دباؤ نیا ڈال رہی ہے، اسی کو استعمال کرتے ہوئے ہم کشمیر کے مسئلے کو حل کریں، جیسے جاپان کی سومو کشتی (sumo wrestling) میں ہوتا ہے کہ دشمن کے دھکے کے زور پر ہی اسے گرایا جاتا ہے۔

دنیا پہلے ہی مانتی ہے کہ پاکستان کے نان اسٹیٹ ایکٹرز کی کارروائیوں کی جڑ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ دنیا کو دکھائیں کہ جنگ اس کا حل نہیں ہے۔ جنگ کے خدشے کی وجہ سے یہ اور بڑھ گئی ہیں۔ واضح کر دیں کہ اس کا مداوا صرف مسئلے کے مکمل حل سے ہی ہو سکتا ہے۔ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی، اور مجاہدین کی کارروائیاں عروج پر ہوں گی، تو اور کوئی راستہ واپسی کا نہیں رہ جائے گا۔ جب دشمن ہمیں میدان جنگ میں گھسیٹ ہی لایا ہے تو پھر اس کو بھی اس کا حرا چکھائیں۔ ہم سے آگ کا کھیل کھیلتا ہے، تو قیامت بھی چکائے۔ اگر ہم پیچھے ہٹ گئے اور ایسا نہ کیا تو اس کے بعد کوئی معنی خیز پیش رفت کشمیر کے سلسلے میں نہیں ہو سکے گی۔ حقیقت پسندی یہ ہے کہ مذاکرات سے کبھی کچھ حل نہیں ہوگا۔ یہ ایک ڈھونگ کے طور پر دونوں اطراف سے کئے جاتے رہیں گے۔ یا ابھی قدم اٹھائیں، یا پھر بھول جائیں۔ مگر یہ بات کسی کو بھی پسند نہ تھی۔ یہ بہترین موقع تھا، ایٹمی طاقت کی آڑ لینے کا، جس سے مکمل جنگ کا خطرہ ملتا رہتا۔ آج ہم کمزور دلوں کو لئے کہتے پھرتے ہیں کہ یہ طاقت ہماری کمزوری ہے۔

میں نے GHQ کی ایک میٹنگ میں بھی چیف صاحب سے اپنے تحفظات کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمیں اس جھوٹے دباؤ میں آکر کشمیر پر اپنے موقف سے نہیں ہٹنا چاہئے۔ میرا کہنا تھا کہ اس ناانصافی اور ظلم کے خلاف اگر آج آواز نہ اٹھائی گئی تو یہ آواز ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے گی۔ مگر انہوں نے میرے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ جنگ کا خدشہ نہیں اور کہا کہ کوئی کشمیر کے جہاد کو جائز نہیں سمجھتا۔ دنیا اسے دہشت گردی ہی مانتی ہے۔ خود جب ہماری قیادت جہاد کے تصور سے شرمندہ ہوگی تو دنیا کو کیا مانیں گے۔ جب میٹنگ سے باہر آئے تو جنرل یوسف کہنے لگے کہ ایسی باتیں مت کرو۔ فوج میدان جنگ میں کھڑی ہے اور فوج کا CGS کہتا ہے کہ جنگ کا خطرہ نہیں، فوج کے مورال (morale) پر برا اثر پڑے گا۔ میں نے کہا کہ میں اعلانیہ تو نہیں کہہ رہا، لیکن فوج کی اعلیٰ قیادت کو تو یہ باتیں سمجھنی چاہئیں تاکہ درست فیصلے کر سکیں، دشمن کے دباؤ میں آکر نہ سوچیں۔ ہم دفاعی طرز (back foot) پر کیوں کھیل رہے ہیں؟ کیا یوں پسپائی اختیار کرنا کسی بھی فوج کا شیوہ ہونا چاہئے؟

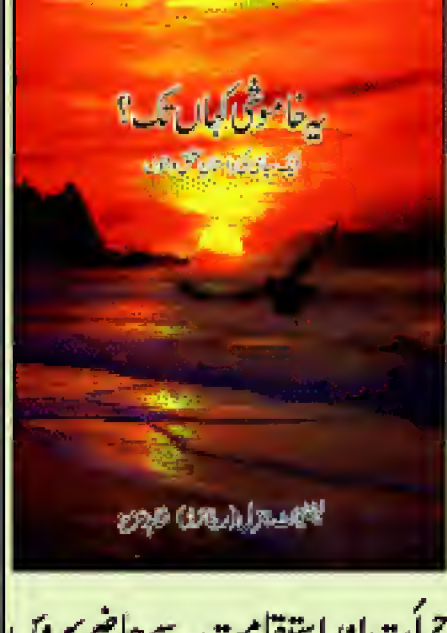
جنرل مشرف کیا خیال تھا کہ یہ وقت ایسا نہیں کہ ہم کشمیر کے سلسلے میں کوئی بھی مطالبہ کر سکیں، ان کا کہنا تھا کہ ہم خود اس وقت دباؤ میں ہیں کہ دہشت گردی بند کریں۔ کہتے تھے کہ کشمیر کا حل صرف پر اس مذاکرات کے ذریعے ہی ممکن ہے، اور دنیا ہمیں کشمیر کی آڑ میں دہشت گردی کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ یہاں بھی مذاکرات کا تقاضا صرف ایک آڑ ہی تھا، جس کے پیچھے چھپ کر کشمیر کو خیر آباد کہا جاسکے۔ جن مذاکرات کے پیچھے کوئی زور نہ ہو، ان سے بھی کبھی ایسے مسئلے حل ہوئے ہیں؟ جب آپ خود کو پہلے ہی نیچے گرا دیں، تو پھر معنی خیز مذاکرات کیسے؟ صرف ایک پردہ، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ اپنی جان بچانے کو کشمیر سے جان چھڑائی۔ ہندوستان تو کبھی اس موقف سے بھی نہیں ہٹا کہ ”کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے“ ہم کیا مذاکرات کرنے چلے ہیں۔

کشمیر کے سلسلے میں ہمیشہ پاکستان کی یہی پالیسی رہی تھی کہ مذاکرات کے کسی بھی پہلو پر بات نہیں بڑھے گی، خاص کر تجارتی معاملات میں ہندوستان کو کوئی چھوٹ نہیں دی جائے گی۔ امریکہ اور برطانیہ کا ہم پر دباؤ رہتا کہ آپ تجارت شروع ہونے دیں، پھر جب ماحول سازگار ہو جائے گا تو کشمیر پر بھی بات ہو سکے گی۔ اس بات میں کسی قسم کی منطق نہیں تھی۔ یہ صرف کشمیر پر اپنے موقف سے منہ موڑنے کی پردہ پوشی تھی، کشمیر کو ہندوستان کا حصہ ماننے کی راہ پر پہلا قدم۔ ہندوستان کی دوستی کے عوض کشمیر کی قربانی۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے، سب جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے پاکستان کا کتنا خسارہ ہوگا۔ لیکن حکومتیں فوری فوائد کی خاطر دور رس نتیجوں کی پرواہ نہیں کرتیں۔ سیاسی مفاد ہمیشہ ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں۔

جب ہندوستان کے مقاصد پورے ہوئے تو انہوں نے اپنی فوجیں واپس لے جانی شروع کر دیں۔ 23 مئی 2002ء کو کورکمانڈر کانفرنس میں جنرل مشرف نے ہمیشہ کی طرح اپنی جیت کا اعلان کیا۔ کہنے لگے کولن پاؤل نے بتایا ہے کہ ہندوستان فوجوں کی واپسی چاہتا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنی برتری اور فوقیت ظاہر کرنے کیلئے کہا ”جو ہم کشمیر میں کر رہے تھے، ساری دنیا جانتی تھی۔ اب ہم مجاہدین کو ہمیشہ کیلئے تورک نہیں سکتے۔ یہ پالیسی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ہندوستان مذاکرات شروع نہ کرے، آبادیوں سے اپنی افواج نہ ہٹائے اور میڈیا اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو کشمیر میں جانے کی اجازت نہ دے۔ اگر جنگ ہوئی تو ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ ان پر نہ میں قابو پاسکوں گا اور نہ ہی دنیا۔ ہزاروں لوگ پاکستان سے اٹھ کر کشمیر میں داخل ہو جائیں گے۔“ مجھے ایسے لگا جیسے 1971ء کی لڑائی میں مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے بعد جنرل یحییٰ نے قوم سے گرج دار خطاب کیا تھا، کہ ہماری جنگ جاری ہے۔ پھر اسی طرح جنرل مشرف نے اپنی جیت کے جشن کے طور پر کہا، ”کُل ہم پہلا غوری میزائل فائر کریں گے۔“ (جاری ہے)

مشرق کی اسرائیل سے سفارتی تعلقات کی تجویز افسران نے مسترد کر دی تھی

امریکہ سے واپسی پر کہنے لگے ”ہم خواہ مخواہ فلسطین کی خاطر عربوں سے بھی سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ اسرائیل سے تعلقات میں بہت فائدہ ہے۔ تم لوگ بات کی گہرائی کو نہیں سمجھتے۔“ عراق میں سپاہ بھیجنے کی تجویز بھی کور کمانڈرز نے نہیں مانی۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



دسمبر 2001ء کے آخری ایام میں ہم نے کواٹ کی جیل خالی کر کر اس میں غیر ملکی اور اس لڑائی سے منسلک پاکستانی قیدی رکھ دیے۔ 80 عرب شہری اور بچے گئے تھے اور بتایا گیا تھا با کردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ

سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون ((9/11 کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا: جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک؟“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

21 اگست 2002ء کو جنرل ڈین میک نیل (General Dan McNeill, US Army) سے جنرل یوسف کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ یہ اُن دنوں افغانستان میں کولیشن فورسز کمانڈر (Commander Coalition Forces, Afghanistan) تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ امریکہ نے ہمیں دونوں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ ایک طرف تو آپ کی فوج نے القاعدہ کو پاکستان میں آنے کا موقع فراہم کیا، ہم کو اپنی کارروائیوں کی کوئی خبر نہ لگنے دی، دوسری طرف سے آپ کے ساتھی ہندوستان نے ہمیں مشرق کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ ان باتوں سے ہمارے بیچ بے اعتباری پیدا ہوئی۔ پاکستان کے تعاون کے بغیر تو آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ افغانستان میں جو ہندوستان کو منظم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، ہمارے لیے دہرا خطرہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ایسی توقع نہ رکھیں کہ اسی دباؤ میں آکر ہم کشمیر کو بھی بھلا دیں گے۔ سخت طبیعت کے انسان دکھائی دیتے تھے، مگر ہنس کر میری باتوں کے گول مول جواب دے دیئے۔

اسی دن براستہ MO، چیف صاحب کا حکم بھی موصول ہوا کہ ہماری فوج کے کچھ افسران افغانستان میں مگرام کے امریکی ہیڈ کوارٹر میں تعینات ہوں گے، تاکہ ان سے بہتر ہم آہنگی رہے۔ پھر ایک سال کے اندر اندر ہماری فوج کا ایک نمائندہ CENTCOM ہیڈ کوارٹر ٹامپا، فلوریڈا (Tampa, Florida) میں بھی بھیج دیا گیا۔ SSG میں تیز رد عمل کرنے والی ٹیمیں (Quick Reaction Force-QRF) تشکیل دی گئیں، جن کی تربیت امریکی تربیلا کے علاقے میں کرتے۔ SSG کی ایک اسٹیشن آپریشنز ٹاسک فورس (Special Operations Task Force-SOTF) فائنا میں کارروائیوں کے لیے قائم کی گئی۔ ان کے لیے فراہم کیا ہوا ساز و سامان بھی تربیلا میں ہی رکھا گیا اور یہیں SOTF کے لیے پہلی کاپڑوں کے پائلٹوں کی رات میں کارروائی کی تربیت بھی دی جاتی۔ کافی امریکی یہاں پر مقیم ہو گئے۔ پھر سپاہیوں کے چالیس چالیس کے گروپ تربیت کے لیے امریکہ جانے شروع ہوئے۔ تربیت کیا تھی، امریکہ کی سوچوں پر ڈھالنا تھا، ان کی محبت پیدا کرتی تھی۔



SOTF پشاور کی کور کے احکام پر کام کرتی تھی، لیکن امریکہ سے زیادہ تعاون ISI کا رہتا اور ان دنوں فوج اور ISI میں FATA کے سلسلے میں خاصا کھنچاؤ رہنے لگا۔ کئی مرتبہ چیف کی موجودگی میں تنازعہ اٹھ چکا تھا۔ پھر چیف نے زور دینا شروع کر دیا کہ SOTF کو ISI کے ہی نیچے کر دیا جائے اور وہ ہی امریکہ سے ملاپ رکھتے ہوئے اس کی کارروائیوں کو کنٹرول کرے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ فوج دل سے اس کام پر مائل نہیں۔ اس پر کافی لے دے ہوئی، مگر فوج آمادہ نہ ہوئی، نہ وائس چیف، نہ کور کمانڈر اور نہ ہی میں۔ فوج کے ایک سیف کی کمانڈر ISI کو کیسے دے دیتے، ISI میں فوجی تو ضرور تھے مگر وہ فوج کا حصہ تو نہیں تھی۔ تنازعہ چلتا رہا۔ فوج کی کارکردگی کی شکایات چیف کو جاتی رہیں۔ امریکہ سے کچھ نہ کچھ فوجی ساز و سامان بھی ملتا رہا، جس میں سامان کم اور ساز زیادہ ہوتا۔ سامان کسی اہم نوعیت کا نہیں تھا اور زیادہ وعدے ہی رہتے۔ سامان کہیں پائپ لائن (pipe line) میں ہی پھنسا رہتا۔ جنرل یوسف ہر درجے پر ملاقات میں اُن سے شکوہ کرتے۔

جنرل مشرف امریکہ کے ایک دورے پر گئے، جہاں یہودیوں نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ یہ سلسلے اخباروں اور ٹی وی پر سب ہی نے دیکھے۔ واپس آئے تو GHQ تشریف لائے اور کہنے لگے ”ہمیں اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کر لینے چاہئیں۔ ترکی کے بھی تعلقات ہیں اور کئی عرب ممالک کے بھی، آخر ہم ہی کیوں اپنا نقصان کر رہے ہیں، ہم خواہ مخواہ فلسطین کی خاطر عربوں سے بھی سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔“ کسی نے بھی اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ کچھ دیر بحث و مباحثے کے بعد ناراض ہو کر چلے گئے۔ کہنے لگے کہ اس میں ہمارا بہت فائدہ ہے، تم لوگ بات کی گہرائی کو نہیں سمجھتے۔

پھر اگلی دفعہ آئے تو کہا کہ امریکہ ہم سے عراق میں فوجی امداد چاہتا ہے۔ اس کی بھی سب نے مخالفت کی کہ ہمیں مسلمانوں کے خلاف اپنی سپاہ نہیں استعمال کرنی چاہئے تو کہنے لگے کہ ہم عوام کی امداد میں سپاہ بھیجیں گے، صرف کچھ ڈاکٹر اور تعمیر نو کے لیے انجینئرز کی سپاہ۔ سب سمجھتے تھے کہ یہ صرف ایک بہانہ ہے، اصل مقصد لڑاکا سپاہ بھیجنا ہی ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی تو ہماری سپاہ FATA میں بھی چاہئے اور ہندوستان کے بارڈر پر اب بھی کچھ فوج لگی ہے۔ ہمارے پاس سپاہ کی بہت قلت ہے۔ کافی ناراض ہوئے مگر اپنی بات سے نہ ہٹے۔

یہ مسئلہ کافی عرصے تک چلتا رہا۔ پھر مئی 2003ء میں کور کمانڈرز کی کانفرنس میں بھی یہ بات اٹھائی گئی، لیکن کور کمانڈر اس پر آمادہ نہ تھے۔ کچھ نے اعتراض کیا، زیادہ خاموش رہے، مگر کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔ کہنے لگے دیکھتے ہیں کہ اس میں خرچے کا کیا بندوبست ہوگا اور یہ کہ آیا اور مسلم ممالک بھی سپاہ بھیجتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو کم از کم UN یا OIC کی چھتری کی آڑ ملنی چاہئے۔ یہ اس لیے لازم تھا کہ زیادہ اعتراضات نہ ہوں۔ مئی کے آخری ہفتے میں عراق پر اقوام متحدہ کی قرارداد بھی آگئی اور کہا گیا کہ DGMO CENTCOM ہیڈ کوارٹر، قطر جائیں تاکہ عراق فوج بھیجنے کے سلسلے میں معاملات طے کر لیں۔ جون میں امریکی ٹیم بھی اس سلسلے میں آئی اور پہلے بتایا گیا کہ ایک ڈویژن بھیجا جائے گا، پھر حکم ملا کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر اور دو پیادہ فوج کے بریگیڈ تمبر کے مہینے میں بھیجیں گے، تیاری کر لیں۔ نہ جانے وہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کو بھیجنے کی کہانی کہاں رہ گئی تھی۔ اگست میں کور کمانڈر کانفرنس میں جنرل مشرف نے پھر کہا کہ سپاہ شاید عراق بھیجی جائیں، ابھی حتمی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور سپاہ عراق نہیں جائیں گی۔ شاید فوج کے علاوہ اور بھی جگہوں سے مخالفت تھی۔

جون 2002ء میں بلوچستان سے متعلق ISI سے ایک رپورٹ ملی کہ خیر بخش مری کو ہندوستان کی خفیہ ایجنسی RAW (Research and Analysis Wing) پیسے دے رہی ہے۔ کئی صاحب نے پہلے ہی خاصے مسائل پیدا کر رکھے تھے اور گیس کی کھوج شروع نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس رپورٹ میں اس سلسلے کی بھی تفصیلات تھیں۔ پھر دو دن بعد بتایا گیا کہ خیر بخش مری نے اپنے قبیلے کے 200 لوگ کئی صاحب کی حفاظت کے لیے فراہم کیے ہیں۔ کئی صاحب کے ساتھ یہ مسائل چلتے رہے۔ ہمیں خبریں ملتی رہیں کہ بلوچستان سے کچھ اور اہم لوگ بھی افغانستان جاتے اور وہاں سے انہیں امریکہ کی طرف سے پیسے دیئے جاتے۔ جنرل مشرف کی حکومت نے بلوچستان کے سلسلے میں کئی اچھے اقدامات بھی لیے، مگر عمومی طور پر معاملہ سلجھا نہیں۔ (جاری ہے)



”شوکت عزیز نے نیب کو معیشت کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا“

بجٹ تھے نیب کی کارروائیوں سے ملک دیوالیہ ہو جائیگا۔ نیب سربراہ جنرل امجد کوہٹا نے پرمشرف نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ سول بیوروکریسی کے دباؤ پرمشرف نے کورکمانڈرز کی تجاویز کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا

فوجی حکومت کے شروع کے سال عام طور پر اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب تک فوجی سربراہ کو سیاسی حکومت کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑا، حکومت اچھی چلتی رہی۔ خرابی کی ذمہ داری سیاستدانوں پر ہی رہی۔ میں نے DGMO کے طور پر اور جب سیاسی حکومت آگئی تو CGS کے طور پر، دونوں دور میں قریب سے حکومت کو کام کرتے دیکھا ہے۔ پورے ملک میں حکومتی ڈھانچے کی مانیٹرنگ بھی کی۔ پھر NAB میں رہتے ہوئے بھی بہت سی باتیں مجھ پر کھلیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اصل میں اونٹ پہلے سال ہی ایک کروٹ بیٹھ چکا تھا۔ دیکھنے والوں کو نظر آتا تھا۔

بہت سے اچھے اقدامات جنرل مشرف نے شروع کیے اور اس وقت ہمارا یہ تاثر تھا کہ بہت خلوص کے ساتھ آغاز کیا۔ پھر جیسے جیسے حکومت کی پیچیدگیوں میں الجھتے گئے، ان کاموں پر ان کی گرفت کمزور پڑتی گئی، جنہیں ہم سب اہم سمجھتے تھے۔ یقیناً پیسے کی قلت بھی تھی، لیکن ایسی بھی نہیں کہ ان تبدیلیوں کے لیے رکاوٹ بنتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات بدلتی گئیں اور ابتدائی اہداف سکڑتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ ہماری سول سروس تھی۔ یہی اس جمود کی جڑ تھی۔ پختے ہوئے مشنوں کی ٹیم کے باوجود انہوں نے کسی چیز کو بدلنے نہیں دیا اور نہ ہی یہ کسی طور پر اپنی

کارکردگی ظاہر کرنے پر رضامند تھے۔ ہر چیز کو خفیہ رکھنا چاہتے، ہر بات کی پردہ پوشی ہوتی۔ ایک دوسرے کو آڑ میا کرتے۔ ملک یہی چلاتے ہیں اور اپنے اس کاروباری نظام کو تحفظ دینا ان کی پہلی ترجیح تھی۔ پھر سیاستدان آگئے۔ یہ بھی صرف ذاتی مفاد پر ہی مرکوز رہے۔ اب خرابی اور بڑھ گئی کہ اب مشرف بھی نااہل آگئے اور سول سروس کے مزید مہم ہون منت ٹھہرے۔ یہ کارکردگی کی بنیاد پر تو آتے نہیں، صرف ووٹ کی بنیاد پر آتے ہیں اور اس ہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ اپنی شخصی حیثیت کے مطابق مشرفی پاتے ہیں۔ سیاست کا سارا کھیل اس ہی ایک اقدار پر چلتا ہے۔ جس کی کوئی ضرور رسانی کی صلاحیت نہیں، اسے استعمال کے بعد چھینک دیا جاتا ہے۔

شروع کے ہی دنوں میں جنرل صاحب نے حکم دیا کہ حکومت کو شفاف بنانے (transparency) کے لیے تمام حکومت کے دفاتر اپنی ویب سائٹ (website) کھولیں گے اور روزمرہ کے فیصلے اور کارروائیاں اس پر ظاہر کریں گے۔ حکومت کے کسی دفتر نے اس پر عمل نہیں کیا۔ مانیٹرنگ نظام کے بہت اصرار پر چند نے ویب سائٹس کھولیں، مگر صرف دکھاوے کے طور پر اپنی کچھ معلوماتی چیزیں ظاہر کر دیں، اس سے آگے نہ بڑھے۔

سب نے کہا کہ ہمارے پاس نہ ہی اس کام کے لیے پیسے ہیں اور نہ ہی صلاحیت۔ حالت جوں کی توں رہی۔ شروع کے دنوں میں جنرل مشرف نے اپنے اٹھائے ظاہر کیے اور احکامات دیے کہ تمام سول سروس بھی ایک دیے ہوئے فارم پر اپنے اٹھائے ظاہر کریں۔ فارم بھی تیار کر لیے گئے۔ کورکمانڈر کانفرنس میں اس بات پر خاص زور بھی دیا گیا۔ اس خبر سے پوری سول سروس میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کہا گیا کہ سول سروس میں اس بے اعتمادی پر بہت بے چینی ہے اور اگر اس بات پر زور دیا گیا تو خطرہ ہے کہ قلم بند (pens down) ہڑتال ہو سکتی ہے۔ جنرل مشرف پیچھے ہٹ گئے۔ آخر حکومت بھی چلائی تھی۔

مانیٹرنگ کا نظام، جو بڑے زور و شور سے شروع ہوا تھا، جلد ہی لڑکھڑانے لگا۔ لپیٹ لیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے خلاف شکایات بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں جنرل مشرف کی خفگیوں سے ہٹا رہا، مگر اسے بچا نہ سکا۔ جب حکومت کو آنکھیں درکار نہیں تو ہم اپنی آنکھیں کب تک پھوڑتے؟ سول سروس نے کہا کہ ہمارے کام میں اتنی مداخلت ہے کہ ہم کام ہی نہیں کر سکتے، فوج کے سوالوں کے جواب دیتے رہیں یا اپنا کام کریں؟ مانیٹرنگ کے نظام میں کوئی فوجی کسی قسم کے احکام دینے کا مجاز نہیں تھا۔ احکامات صرف حکومتی نظام کے ذریعے ہی دیے جاسکتے تھے۔ پھر بھی یہ بوجھ دکھائی دیا۔ کہا گیا کہ فوجی افسران اپنے ذاتی کام زیادہ کرواتے ہیں اور سرکاری کاموں پر کم توجہ دیتے ہیں۔ یقیناً کہیں ایسا بھی ہوا ہوگا، مگر اسے کافی حد تک روکا جاسکتا تھا، فوج کو قابو کرنا مشکل نہیں۔ شکایت کی وجہ یہ نہیں تھی۔ ہمارے حکومتی طور طریقوں کو میں نے بہت غور سے دیکھا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل غلط تاثر تھا۔ میں نے سرکاری ملازمین میں ایک سے ایک عمدہ انسان بھی دیکھے ہیں، مگر عام طور پر، سرکاری ملازمین، بالا افسران کے ذاتی کام ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور انہیں پورا کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں اور چاہئے ہی کیا کہ ان کا بالا افسران کا شکر گزار رہے۔ جب ان کے اوپر دالان سے خوش ہے تو پھر انہیں کون پوچھے گا؟ ان کی تو آرزو رہتی ہے کہ بڑے صاحب کو ”کانا“ کر دیں۔ جتنو صرف اتنی تھی کہ ہمارے کام پر کسی کی نظر نہ ہو۔ کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ جو مشاورتی کونسل چیف ایگزیکٹو کی امداد کے لیے بنائی گئی تھی، گھر بھیج دی گئی۔ وزارتوں کی تجاویز سول سروس کی بنائی ہوئی ہوتیں اور جب چیف ایگزیکٹو کو ان کے برخلاف مشاورتی کونسل مشورہ دیتی تو پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ اسے ختم کرنا ہی مناسب سمجھا گیا، حالانکہ وہ صرف اجتماعی دانش (collective wisdom) تھی، ایک اچھا مشورہ ملتا تھا۔ سربراہ کا دماغ اس حکمت سے محروم ہو کر، پورے طور پر سول سروس کے تابع ہوا۔ نمبروں کو یاد رکھنے کی اچھی صلاحیت تھی، عسکران نے اسی جھلکتی دانائی پر اتکنا کیا۔ کرپشن کے خاتمے کے لیے نیشنل اکاؤنٹیبلٹی بیورو (NAB) کھڑا کیا گیا اور ایک سخت قانون بنا، جو نہایت موثر تھا۔ شروع میں (NAB) کی کارروائی تیز تھی، لوٹے ہوئے اربوں روپے واپس آئے۔ پھر کچھ ہی عرصے میں شوکت عزیز صاحب کا محکمہ پریشان ہونے لگا۔ کہنے لگے سارا پیسہ ملک سے باہر جا رہا ہے، اگر NAB کو نہ روکا گیا تو ملک دیوالیہ ہو جائے گا۔ پیسے والوں سے یہ پوچھنا چھوڑیں کہ اتنی دولت کہاں سے کمائی۔ سول سروس کا بھی لگا تار دباؤ رہا کہ سرکاری ملازمین NAB کی وجہ سے خوف و ہراس کا شکار ہیں، کسی کی بھی عزت کو تحفظ نہیں۔ اس خوف سے لوگ فیصلے کرنے سے گھبراتے ہیں اور یوں حکومت کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ حکومت کا کام رک جائے گا اور معیشت ڈوب جائے گی۔ جس کی وجہ سے عوام ہی خسارے میں رہیں گے، غریب کا بہت نقصان ہوگا۔ NAB کے سربراہ جنرل امجد کوہٹا دیا گیا۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ جنرل مشرف نے بھی۔ جو سول سروس کی اصلاحات تھیں، کچھ عرصہ ادھر ادھر لڑھکتی رہیں، پھر دم توڑ گئیں۔ ڈسٹرکٹ منجمنٹ گروپ (DMG) نے کہا آپ نے ہماری کمری توڑ دی۔ بے معنی سی چند تبدیلیاں ہوئیں اور کچھ نہیں۔ نیا پولیس آرڈیننس تیار کیا گیا، مگر پولیس کی کارکردگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ کہا گیا کہ اس کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے پیسہ درکار ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہم نے ان سے بہت سے غلط کام کروانے ہوتے ہیں، پھر جب یہ ہمارے ناجائز کام کرتے ہیں تو انہیں اپنے لیے غلط کام کرنے سے کوئی کیسے روکے؟

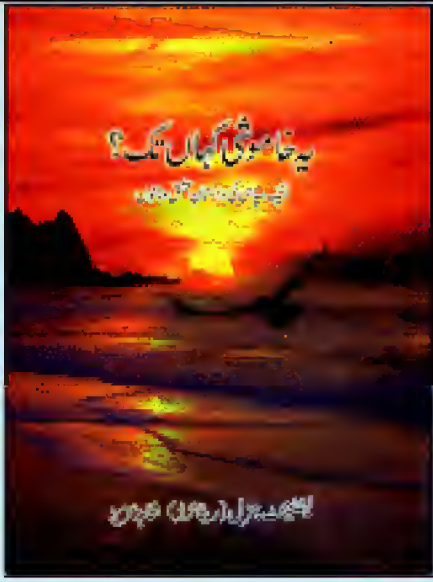
عدالتوں میں انصاف مہیا کرنے کے لیے جنرل مشرف نے یہی کہا کہ ابھی پیسے نہیں ہیں، پہلے پیسے بنالیں پھر یہ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ کیسے کہتے کہ عدالتوں نے اگر انصاف شروع کر دیا تو حکومت کیسے چلے گی؟ ایک مرتبہ فوج نے بہت زور دے کر جسٹس فلک شیر صاحب کو لاہور کا چیف جسٹس لگوا دیا۔ ان کا نام لوگ بہت عزت سے لیتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں یہ شکایت آئی کہ یہ کیسے لگوا دیا، یہ تو کسی کی سنا ہی نہیں۔ پھر موقع پاتے ہی انہیں سپریم کورٹ منتقل کر دیا گیا۔ کتنی مشکل سے ایسا ڈھونڈا تھا جو سنا نہیں تھا، لیکن حکومت کے گلے میں پھنسنے لگا۔

اب سات نکاتی ایجنڈا سکڑنے لگا اور توجہ صرف مالیاتی حیثیت بہتر کرنے پر مرکوز کر دی گئی۔ باقی کچھ ہو جو نہیں رہا تھا اور پھر کامیابی بھی تو دکھائی تھی۔ مگر جب امریکی حمایت کے عوض ملک میں غیر ملکی پیسہ آ بھی گیا تو کیا ٹھیک ہوا؟ ایک مرتبہ کورکمانڈر کانفرنس میں نکتہ چینی کی گئی کہ تمام معاشی ترجیحات ایسی ہیں کہ پیسے والا ہی امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ غربت پر ہماری پالیسیوں کا کچھ اثر نظر نہیں آتا۔ جنرل مشرف نے شوکت عزیز صاحب کا فلسفہ دہرایا کہ جب اوپر کی سطح پر پیسہ آئے گا تو آہستہ آہستہ trickle نیچے پھنچیں گے، یہی معیشت کا اصول ہے، اس میں ذرا وقت لگتا ہے۔ صبر کرنا ہوگا۔ نیچے والے پیچھے آج تک صبر ہی کر رہے ہیں۔

پھر وزارت خزانہ سے ایک تجویز آئی کہ ٹیکس دینے والوں کی تعداد بڑھائی جائے (broadening the tax base)۔ اس سلسلے میں فوج کو کہا گیا کہ CBR (آج کا FBR) کی امداد میں تجارتی طبقے سے نئے ٹیکس فارم بھروائے جائیں۔ میں نے کہا کہ فوج کی بندوقوں کے زور پر دکانداروں کے اوپر ایک کرپٹ محکمہ کو حملہ آور نہ کرایا جائے۔ اگر عوام پر یوں بوجھ ڈالنا ہی ہے تو پہلے اس محکمے کی کچھ صفائی کر لیں۔ پھر اس میں سے چند لوگوں کی لسٹ تیار ہوئی کہ یہ کچھ زیادہ ہی خراب ہیں۔ چیئر مین CBR نے کہا کہ اگر آپ صرف صاف لوگ ہی چاہتے ہیں تو CBR میں میرے پاس ایک بھی آدمی ایسا نہیں جو ”نلی واٹ“ ہو۔ جو ہیں ان ہی سے کام چلائیں۔ پھر دکان دکان پھر کر رسوا ہوئے۔ دکانداروں نے ہڑتالیں شروع کر دیں اور کچھ دن خوب ہنگامہ ہوا۔ آخر حکومت پیچھے ہٹ گئی اور دکانداروں سے مذاکرات کر کے ٹیکس فارم چھا ڈالا، اپنے ٹیکس کے اہداف ہی تبدیل کر لیے۔ پھر کہا کامیابی ہوئی۔ (جاری ہے)

”مشرف نے جان بوجھ کر مکر و سیاسی قیادت کا انتخاب کیا“

تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ فوج کی سخت مخالفت کے باوجود چوہدری برادران کو حکومت میں شامل کیا گیا۔ نیشنل سیکورٹی کونسل کا حکومت میں کوئی کردار نہیں تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



پیریم کورٹ نے جنرل مشرف کو تین سال کا عرصہ دیا تھا کہ الیکشن کرا کے حکومت، عوام کے نمائندوں کو 2002ء تک سوئپ دی جائے۔ جنرل مشرف کو کچھ کورکمانڈرز نے کانفرنس میں کہا کہ آپ خود سیاست میں نہ الجھیں، گندے ہوں گے۔ آپ صاف ستھرے لوگوں کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دیں اور خود کو اس سے اوپر رکھیں۔ اگر حکومت صحیح کام نہیں کرتی تو سیاسی نظام اسے بدل دے گا۔ کہنے لگے کہ جو سیاسی پنڈت ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سیاست سے باہر رہو گے تو کوئی چیز قابو میں نہ رہے گی۔ اگر حکومت کرنی ہے تو سیاست کے میدان میں اترنا ہی پڑے گا اور یہ کھیل ہے ہی گندا تو پھر گندا ہونا پڑے گا۔

ناکارہ اور کمزور سیاسی قیادت کے چناؤ کی بھی یہی وجہ تھی کہ طاقت کا سرچشمہ فوجی ٹوپی کے نیچے ہی رہے۔ اس کے لیے تابعدار سول سروس، طارق عزیز صاحب کی سربراہی میں حاضر تھی۔ جنرل مشرف کی نئی ٹیم۔ بندوق کی ٹوک پر جاگیردارانہ، موروثی سیاسی نظام ختم کر کے نیا سیاسی نظام لانا تھا، جو لوگوں کی امنگوں کا آئینہ دار ہوتا۔ یہی حکمران کا شروع سے منصوبہ تھا اور یہی وعدہ۔ شروع کے دنوں میں فوج کا بھی اس سلسلے پر خاصا زور تھا۔ کوئی کہتا صدر اتنی نظام لگا دیں، ہمارے ملک کے لیے یہی موزوں ہے۔ کوئی کہتا یہی نظام ٹھیک ہے، بس الیکٹورل نظام کو مضبوط کریں، تاکہ اچھے لوگ ابھر سکیں۔ اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ایک مرتبہ جنرل صاحب کہنے لگے کہ میں چین گیا تھا، وہاں اپنے چینی بھائیوں سے بھی مشورہ کیا۔ ان کی بات میں بہت گہرائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نظام جو بھی ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا، اہم چیز یہ ہے کہ جو بھی نظام ہو اس کی ملک پر گرفت صحیح ہونی چاہئے۔ مسکرائے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ سوچا ہوگا میں کمانڈ وہوں، سخت گرفت رکھتا ہوں، بس اتنا کافی ہے۔ یہ نہیں سوچا کہ چینی بھائی نے کہا تھا کہ نظام کی گرفت ہونی چاہئے، ناظم کی نہیں۔ اس نظام کی گرفت میں تو کچھ بھی نہیں تھا، سوائے کسی لاچار شخص کے اور یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر مان بھی لیں کہ فوجی حکمران سخت گرفت سے چیزوں کو قابو کر لے گا تو پھر اس کے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ ناظم تو بدلتے ہی رہیں گے، نظام مضبوط نہ ہوا تو ملک تو پھر بھی ڈوب ہی جائے گا۔

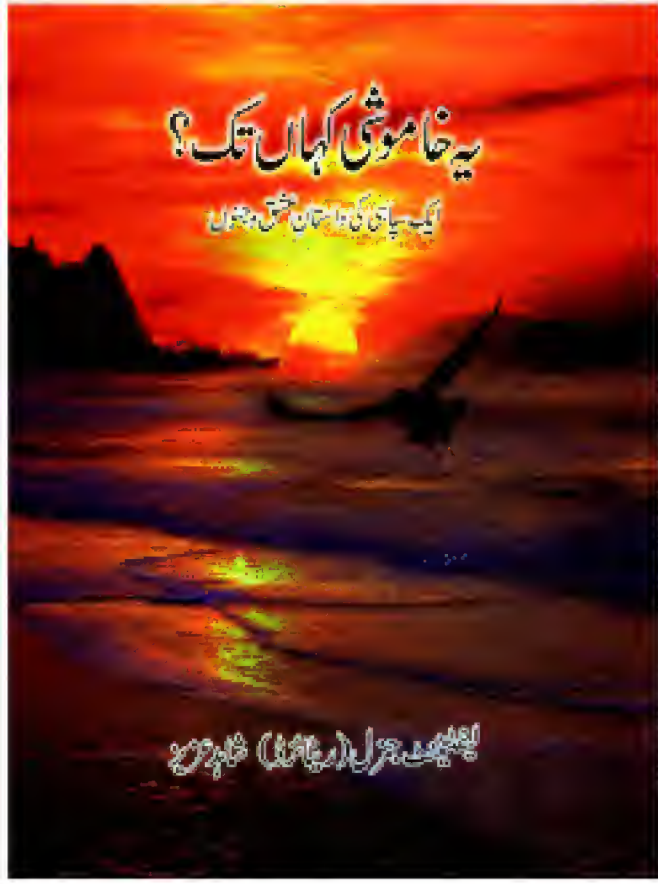
جنرل مشرف کو عوام کا تعاون بھی حاصل تھا، فوج بھی ساتھ کھڑی تھی اور پوری دنیا نے بھی گلے لگایا ہوا تھا، کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اتنی طاقت کسے ملتی ہے؟ لیکن ملک کو نیا نظام دینے کی سمت کوئی کام نہ کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ اتنا بڑا جھمیل کون سر پر اٹھائے، شاید اس لیے بھی کہ اگر نیا مضبوط سیاسی نظام تشکیل دیا جاتا، جس میں ملک کے بہترین لوگ آگے آسکتے اور حکومت کارگر ہوتی تو ایسا نظام خود طاقت اختیار کر لیتا۔ پھر ان سب کا کیا ہوتا؟ سیاسی ڈھانچے میں رد و بدل صرف سترہویں ترمیم تک ہی رہی۔ نظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ظاہر ہے، اب جو

موجودہ نظام کے تحت منتخب ہو کر آئیں گے وہ کیسے اس نظام کو بدلیں گے، جس کے زور پر انہیں طاقت ملی۔ نظام یہی رہے گا جب تک اسے فوج کرنہ ہٹایا جائے۔ نیشنل سیکورٹی کونسل (NSC) پر اکتفا کیا گیا اور یہ ادارہ بھی ناکارہ ہی رہا۔ اس کا حکومت میں کوئی کردار (contribution) نہیں تھا۔ بلدیاتی نظام (local government) پر جنرل نقوی کی قیادت میں خاصا کام کیا گیا، مگر نہ ہی یہ سول سروس کو بھایا اور نہ ہی سیاستدانوں نے اسے قبول کیا۔ سول سروس کی گرفت میں سختی نہ رہی جو انگریز بادشاہ عطا کر گیا تھا اور خلی سطح پر بھی عوام کے نمائندوں کے تابع ہوئی۔ کیوں خوش ہوتی؟ سیاستدانوں کو یہ شکایت رہی کہ کیا پارلیمنٹ صرف قانون سازی ہی کرے اور سارا ترقیاتی بجٹ ناظمین کو ہی ملے؟ صوبائی حکومتوں نے کہا کہ ناظمین خود مختار ہیں، پھر ہماری کیا طاقت رہ گئی؟ جھگڑا سارا طاقت اور پیسے کا تھا، عوام کی بہتری کا نہیں۔ کچھ رد و بدل کی گئی، طاقت اور پیسے کو بانٹا گیا، لیکن پھر بھی کوئی خوش نہ تھا۔ یہ نظام بھی ناکارہ ہوا۔ جب اوپر کی سطح پر نظام میں تبدیلی نہ لائی جائے تو نیچے کوئی تبدیلی کیسے آئے؟ یہ سارا نظام ان ہی سیاستدانوں نے تشکیل دیا ہے اور اس جمود اور بدستور حالت (status quo) کو ہلانے میں ان سب کا نقصان ہے، جو اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ کیونکر یہ اقتدار اور پیسے کے پجاری اس نظام میں کوئی تبدیلی لانے دیں گے۔

جنرل مشرف نے پھر کورکمانڈر کانفرنس میں یہ صفائی پیش کی کہ جہاں تک شفاف سیاستدانوں کا سوال ہے تو جتنے سیاستدان ہیں، جب تک طاقت میں نہیں آئے تھے تو سب ہی صاف تھے۔ یہ گند تو بعد میں ان سے چپکا۔ تو اگر ہم صاف لوگوں کو لے لیں تو کیا گارنٹی کہ کل جب یہ طاقت میں آتے ہیں تو گندے نہیں ہو جائیں گے؟ پھر ہم پہلی بار سیاسی نظام کو چلانے لگے ہیں، ضروری ہے کہ یہ لوگ ہمارے قابو میں رہیں۔ شفاف لوگوں کو کون قابو کرے گا؟ وعدہ کیا کہ اگلے الیکشن میں شفاف لوگوں کو ہی لاؤں گا۔ یوں چوہدری برادران کو فوج کی سخت مخالفت کے باوجود سیاسی قیادت کے لیے جگہ ملی۔ پھر جنرل مشرف کو سیاستدان بن کر، وردی پہنے، قماش قماش کی ٹوپوں میں سب نے دیکھا۔ فوجی ٹوپیاں پہننے والے وردی کی اس بے حرمتی پر کڑھتے رہے۔ (جاری ہے)

مرضی کے خلاف بات سن کر مشرف ناراض ہو جاتے تھے

کورکمانڈر کانفرنس میں سابق صدر نے کہا کہ پیپلز پارٹی کو توڑا اور مسلم لیگ ”ن“ کو کمزور کیا جائے گا۔ ووٹروں کی عمر 18 سال کرنے کا مقصد نو جوانوں سے زیادہ ووٹ حاصل کرنا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



یہ نہیں تھا کہ جنرل صاحب کورکمانڈروں کو آگاہ نہیں رکھتے تھے، لیکن اتنا ہی بتاتے جتنا مناسب ہوتا۔ یعنی need to know basis کی بنیاد پر۔ کیا کچھ چھپا رہتا، بعد میں پتا چلتا۔ ہر کانفرنس میں لمبی لمبی باتیں کرتے، پھر لوگوں کو بولنے کا موقع دیتے، تسلی سے بات سنتے، صرف شکوے مٹانے کے لیے۔ لیکن اگر کوئی ان کی سوچ سے زیادہ دور ہٹ جاتا، یا وہ دیکھتے کہ مخالفت بڑھ رہی ہے تو ناراض ہو جاتے۔ پھر چپ چھا جاتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ زیادہ گھمبیر ہوتا گیا۔ آخری دنوں میں کچھ سننے کا حوصلہ ہی نہیں رہا۔ لوگ زیادہ اختلافات کرنے سے کتراتے۔ کچھ تو ہلکا سا اشارنا کہہ کر کنارے ہو جاتے کہ میں نے تو کہہ دیا اور اس طرح سرخرو ہو جاتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو مباحثہ کرتے، ان کی باتیں بھی سنتے، غصہ بھی سہتے۔ مگر آخر میں جنرل صاحب کرتے وہی جو کر رہے ہوتے۔ کہتے تم لوگوں کی نظر پوری تصویر پر نہیں۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور بہتر سمجھتا ہوں۔

مارچ 2002ء میں ریفرنڈم کی خبریں آنے لگیں اور کورکمانڈر کی ایک کانفرنس میں جنرل مشرف نے یہ بات اٹھائی کہ صدر کو پانچ سال کے لیے قانونی طور پر جائز (legitimate) قرار دینے کے لیے کیا کیا جائے؟ کچھ نے کہا ریفرنڈم کرائیں، کچھ نے کہا الیکشن کے بعد پارلیمنٹ کا راستہ لیں، کچھ نے کہا صدارتی نظام لگا دیں۔ مگر سب نے اس بات پر زور دیا کہ صاف ستھرا نظام لائیں، خراب لوگوں کو اندر نہ آنے دیں۔ پھر اپریل میں جب ریفرنڈم ہوا تو کئی جگہوں پر جتنے ووٹ جنرل مشرف کو ملے، کل اتنے ووٹ بھی نہ تھے۔ سول سروس خدمت کے لیے بچھ گئی۔ فوج کو سیکورٹی کا کام سونپا گیا اور عام تاثیر دیا گیا کہ ریفرنڈم فوج کروا رہی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ کوئی بھی الیکشن فوج نہیں کرداتی۔ نہ ہی وہ پولنگ بوتھ کے اندر جاسکتی ہے اور نہ ہی اس جگہ داخل ہو سکتی ہے جہاں ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے۔ بس گنتی ختم ہونے پر نتیجہ جب باہر نکلتا، وہ حاصل کر کے تیزی سے اپنے مواصلاتی نظام پر ہمیں بھیج دیتی۔ جو نتیجہ دی وی پر دکھایا جاتا تھا وہ بہت کم کر کے دکھایا جاتا، ورنہ جو ووٹوں کی گنتی کا اصل نتیجہ فوج کو موصول ہو رہا تھا، دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ افسوس، میں نے اپنی زندگی کا پہلا اور شاید آخری ووٹ اس ریفرنڈم میں مشرف صاحب کو دیا۔

اس کے نتائج کے خلاف کافی شور مچا، مگر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ جنرل مشرف نے معافی مانگ لی اور پانچ سال کے لیے صدر مقرر ہوئے۔ اس موڑ پر پہنچ کر قوم میں آخر یہ بات کھلنے لگی کہ حاکم ایسا نہیں جیسا سمجھتے تھے۔ جو اندر بیٹھے تھے پہلے سے جانتے تھے، مگر جب اپنے پاؤں پر کھلاڑی مار چکے ہوں تو پھر لنگڑا کر چلنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

نواز شریف صاحب کو جہاز ہائی جیکنگ کی عمر قید سزا ملی۔ پھر وہ مشرف صاحب سے کوئی معاہدہ کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔ میں جانتا نہیں کیا معاہدہ تھا۔ 31 جنوری 2002ء کو کورکمانڈر کانفرنس میں سیاسی حالات پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جنرل مشرف نے کہا کہ ہم PML(Q) کی امداد کریں گے، جو ان دنوں طارق عزیز (principal secretary) صاحب کی کوششوں سے تشکیل دی جا رہی تھی۔ کہنے لگے کہ PPP کو توڑا جائے گا اور PML(N) کو کمزور کیا جائے گا۔ اگست 2002ء کے الیکشن کی تیاری کا عجیب تماشا تھا۔

ووٹ دینے کی عمر 21 سے گھٹا کر 18 سال کر دی گئی، کیونکہ اندازہ تھا کہ اس گروپ میں روشن خیال اعتدال پسندی (Enlightened Moderation) کے پروگرام کی وجہ سے جنرل مشرف کے حامی زیادہ ہوں گے۔ خیال تھا کہ خواتین کے لیے جتنے کام مغربی ممالک کو خوش کرنے کے لیے کیے ہیں، ان سے خواتین میں بھی مقبولیت ہوگی۔ اس مقبولیت کو اور بڑھانے کے لیے انہیں اسمبلی میں 60 مخصوص (reserved) سیٹوں کا کوٹہ الاٹ کیا گیا، تاکہ خواتین کا زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کیا جاسکے۔ اس ہی طرح اقلیتوں کو بھی بالواسطہ حیثیت سے منتخب ہونے کے علاوہ عام انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی اجازت بھی دی گئی۔ دین کے خلاف اپنے اس نئے پروگرام کی وجہ سے ان کا بھی تعاون حاصل تھا۔ پھر الیکشن میں حصہ لینے کے لیے گریجویٹیشن کی شرط رکھ دی کہ زیادہ پرانے سیاستدانوں کا صفایا کیا جاسکے۔ یہ بھی قانون بنادیا کہ کوئی بھی دو مرتبہ وزیراعظم یا صدر نہیں رہ سکتا۔ بینظیر اور نواز شریف تو یوں باہر ہوئے۔ آخر میں نیشنل اسمبلی کی سینیٹ 217 سے بڑھا کر 342 کر دیں۔ الیکشن کے حلقوں کی پرانی حدیں تبدیل ہو گئیں، خواہش کے مطابق نئی حد بندیوں کی گئیں اور نئی سیٹوں پر اپنے لوگوں کے جیتنے کی امید زیادہ ہوئی۔ ناظمین نے بھی خوب ساتھ دیا۔ لیکن ان تمام کے باوجود الیکشن دھاندلی کے الزامات سے بھرے پڑے تھے۔

مشرف صاحب نے 2004ء کے آخر تک وردی اتارنے کا وعدہ کیا۔ پھر ایک فوج کی سالانہ کانفرنس میں، جہاں تمام جنرل حاضر تھے، اس پر بات کی۔ میں نے کہا کہ فوج آج تک پچھلے فوجی حکمرانوں کے کیے پر بدنام ہے۔ 1971ء کا کچھ آج بھی ہر فوجی، جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا، اپنے منہ پر لیے پھرتا ہے۔ آپ نے جو وعدے کیے تھے، ہم ان کے قریب بھی نہیں پہنچے۔ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے پورا کریں۔ اگر آپ اس حال میں ملک کو چھوڑ کر جائیں گے تو فوج کبھی اس بدنامی کے داغ کو نہیں دھو سکے گی۔ کہنے لگے میں صرف وردی اتارنے کا پوچھ رہا ہوں، گھر جانے کا تو نہیں کہہ رہا۔ انہوں نے میری پوری بات میں صرف یہی سنا۔ میں نے کہا جب وردی اتاری تو سمجھیں گھر گئے۔ کافی دیر اس موضوع پر بات ہوئی، مگر میں اور کچھ نہ بولا۔ سوچا یہ بھی نہ کہتا تو بہتر تھا، غلطی کی۔ جنرل مشرف سے اتنی ناامیدی کے باوجود، مجھے سیاستدانوں سے کسی قسم کی بہتری کی کوئی امید نہیں تھی اور نہ ہی اس سیاسی نظام پر کوئی بھروسہ تھا۔ کچھ نے وردی اتارنے کا کہا، کچھ نے کہا نہ اتاریں۔ کہنے لگے میں سوچ کر فیصلہ کروں گا۔ پھر مشرف صاحب کے آخری دنوں میں فوج کو وہ وقت بھی دیکھنا پڑا کہ فوجی منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ گھر سے سول کپڑے پہن کر نکلتے اور وردی دفتر میں جا کر پہنتے۔ محفل میں تعارف کراتے تو اپنا عہدہ چھپاتے۔ (جاری ہے)

عسکری ساز و سامان میں کیشن کی وبا ختم کرائی

وزارت دفاع نے اسلحہ بیچنے والی کمپنیوں کو فری ہینڈ دے رکھا تھا۔ کاروباری نمائندوں کا جی ایچ کیو میں داخلہ بند کر دیا مشرف کی ناراضگی کے باوجود سیکورٹی کلیئرنس دینے سے بھی انکار کر دیا۔ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباسات



یہ خاموشی کہاں تک؟
لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر مروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا: جو رکے تو کو گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

”میں کل آرہا ہوں، مجھے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے، اب اسلام آبادی میں رہوں گا۔“ میرے ایک بہت قریبی رشتہ دار کا، جو ان دنوں نوکری کے سلسلے میں پریشان رہتے تھے، فون تھا۔ کہنے لگے، آپ سے بھی تعلق رہے گا۔ میں نے پوچھا کیسا تعلق، تو کہا کہ آکر بتاؤں گا۔ میں ابھی نیا نیا ہی CGS بنا تھا، گھر بھی نہیں ملا تھا، میس میں رہ رہا تھا۔ جب آئے تو کہنے لگے، اسلام آباد میں اتنا ترک روڈ پر ایک شاندار مکان بھی مل رہا ہے، تنخواہ بھی بہت اچھی ہے۔ پتا چلا کہ پاکستان کی ایک اثر و رسوخ رکھنے والی کاروباری شخصیت نے، اپنے فوج سے منسلک کاروبار کے دفتر کا سربراہ بنا لیا ہے۔ ان کے دفتر میں چند ریٹائرڈ بریگیڈیئر صاحبان بھی ملازم تھے، جواب ان کے نیچے کام کریں گے۔ یہ کمپنی فوج کو پہلی کا پٹر اور دیگر بڑے ساز و سامان فراہم کرتی تھی اور ان کا کاروبار کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ میں چونک پڑا۔ یہ مجھ پر ہتھیار فروشوں کا پہلا حملہ تھا۔

میں نے اپنے رشتہ دار سے کہا تم کن چکروں میں پڑ گئے، تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ بندوق میں گولی کدھر سے ڈالتے ہیں، اتنا بڑا کاروبار کیسے سنبھالو گے؟ کہنے لگے آپ فکر نہ کریں

میں سب سنبھال لوں گا۔ میں نے کہا آپ کا جہاں جی چاہے نوکری کریں، مگر مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ کہنے لگے، نہیں آپ سے کیا توقع رکھنی، کیا میں آپ کو جانتا نہیں؟ آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ بس اگر کہیں ملاقات کرنی ہو تو آپ اتنا کروں کہ ان سے کہہ دیں کہ وہ ہم سے مل لیں، باقی میں سنبھال لوں گا۔ آپ سے غلط کام تو کروانا نہیں۔ میں نے کہا میں اس سلسلے میں کوئی ٹیلیفون نہیں کروں گا اور نہ ہی اس قسم کی اور کوئی امداد کر سکتا ہوں۔ ایک ٹیلیفون سے ہی ان کا سب کام ہو جاتا اور میرا کام تمام۔ مجھ پر خاندان والوں کا بھی بوجھ پڑتا رہا کہ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ انہوں کی ذرا سی مدد کرو؟ میں نے کہا، ذاتی طور پر ہر مدد کیلئے تیار ہوں، لیکن اپنے دفتر سے نہیں۔ پھر طے بھی نہ کیا اب بڑے آدمی بن گئے ہیں، نظریں پھیر لی ہیں۔ غرور اور خود غرضی کے الزامات بھی ہے۔ نہ جانے اس کاروباری شخصیت نے انہیں کیسے ڈھونڈ نکالا تھا۔

فوج میں ہر سال بجٹ کا ایک بڑا حصہ فوجی سامان کی خرید میں لگتا ہے۔ فوج کے اندر یہ سارا سلسلہ CGS کے تحت کام کرتا ہے۔ ایک مخصوص ڈائریکٹریٹ، W&E (Weapons and Equipment Directorate)، اس کام کیلئے موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایک ITD (Inspectorate of Technical Development) ہے جو تمام اشیا کی فنی موزونیت کو جانچتی ہے۔ فوج کے ہر شعبے کی اپنی ڈائریکٹریٹ بھی CGS کے نیچے کام کرتی تھی۔ یہ ڈائریکٹریٹس اپنی ضروریات کی فہرست بناتیں اور IMO ان کا تجزیہ کرتا، تاکہ ضروریات کو اہمیت کے لحاظ سے ترجیح دی جاسکے۔ پھر ایک سالانہ کانفرنس میں CGS، بجٹ کو دیکھتے ہوئے ان تجاویز پر فیصلہ کرتا ہے کہ کیا کچھ اس سال خریدا جائے گا۔ اس حتمی لسٹ کو وزارت دفاع بھیج دیا جاتا ہے، پھر ان کی خریداری وہی کرتے ہیں۔ اس کام کی نگرانی اور وزارت دفاع سے ارتباط W&E کرتی ہے۔ اگر کوئی نیا سامان ہو تو فوج میں اس کو آزما یا (trials) جاتا ہے۔ سامان بیچنے والی کمپنیوں کے نمائندے، اس سلسلے سے منسلک تمام فوجی دفاتروں سے اپنا میل جول شروع کرتے ہیں، پھر ITD اور W&E میں اثر و رسوخ استعمال ہوتا ہے اور آخر میں ساری توجہ وزارت دفاع پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ میں MO میں دو سال بریگیڈیئر کے طور پر اور پھر دو سال DGMO کے طور پر اس کام سے منسلک رہا۔ پھر CGS کے طور پر دو سال اس تمام عمل کی سربراہی کی اور بغور مشاہدہ بھی۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کام میں فوج کا بہت سا پیسہ کیشن کی صورت میں، کچھ مخصوص لوگوں کی جیبوں میں پہنچ جاتا ہے۔

MO میں دو مختلف عہدوں پر تجربے کے بعد، جہاں مجھ پر ہتھیار فروشوں کی زور آزمائی ہو چکی تھی، میں نے آتے ہی اس سلسلے کو محدود کرنے کیلئے اقدامات لینے شروع کر دیے۔ پہلا کام یہ کیا کہ جو ان کے نمائندے GHQ میں کھلے عام پھرتے تھے، ان کا داخلہ بند کیا۔ ان کے لیے ایک گیٹ کے نزدیک پرانی بیرک کو شیک کر دیا اور اس میں کئی کمرے میٹنگ کیلئے بنوائے۔ پھر اس کا ایک باقاعدہ نظام قائم کیا۔ W&E میں ایک ٹیلیفون نمبر دیا جس پر تمام ملاقاتی کا نام لیتے۔ ملاقات میں GHQ کے کم از کم تین افسر موجود ہوتے۔ W&E کا متعلقہ افسر، اس ڈائریکٹریٹ کا افسر جن کا سامان ہوتا اور ITD کا افسر۔ ملاقات صرف دی ہوئی جگہ پر ہوتی اور اس کی تفصیل کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا۔ ملاقات کے کمرے MI کے انتظام میں تھے اور ہر کمرہ ٹی وی کیمرے سے آراستہ۔ اس کی آگاہی کیلئے نشانات بھی لگا دیے گئے کہ ہر کمرہ ٹی وی کیمرے سے مانیٹر ہوتا ہے۔ MI بھی ملاقاتیوں کا ریکارڈ رکھتی۔

پھر یہ احکامات جاری کیے کہ کوئی بھی افسر جو فوجی سامان کی خرید سے منسلک ہے، ان کمپنیوں کے نمائندوں سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھے گا، سوائے مخصوص ملاقات کی جگہ پر۔ ان سے فون پر رابطہ رکھنا، ان سے ملاقات یا ان کی دعوت میں شمولیت یا تحائف وصول کرنا قانون کی خلاف ورزی قرار دی۔ کچھ اعتراضات مجھ تک پہنچے کہ افسران پر اعتبار نہیں کیا جا رہا۔ میں نے کہا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ کس قدر بدنام ہے تو بہتر نہیں کہ ہر بات کھلی ہو اور آپ کا نام محفوظ رہے؟ یہاں تکلف کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کافی کوشش کی کہ وزارت دفاع اور GHQ مل کر پورے نظام کا تجزیہ کر لیں، تاکہ کرپشن کی روک تھام کی جاسکے، مگر منسٹری کا کہنا تھا کہ ہمارے طریقے صحیح چل رہے ہیں، کوئی رد و بدل کی ضرورت نہیں۔ آپ GHQ میں جو چاہیں کریں، وزارت دفاع کے کام میں دخل نہ دیں۔

میں نے پھر اپنے رشتے دار سے کہا کہ آپ جب تک فوج سے منسلک کاروباری ادارے کے ساتھ نوکری کر رہے ہیں یا میں جب تک اس کرسی پر ہوں، مجھ سے تعلق نہ رکھیں، نہ ہی میرے گھر آئیں اور نہ ہی گھر میں کسی ٹیلیفون کریں۔ اس کے علاوہ آپ کی اپنی مرضی ہے جو چاہیں بخوشی کریں۔ میں آپ کو نوکری سے منع نہیں کروں گا، وہ آپ کا فیصلہ ہے۔

قانونی ماہرین سے مشورہ کیا کہ میں ایسے کاروباری شخص کو بلیک لسٹ (black list) کر سکتا ہوں جو فوج کیلئے سامان خریدنے کے نظام کو یوں ناکارہ (neutralize) کرنے کی کوشش کرے۔ تاہم اگر اس سلسلے میں کوئی قانونی کارروائی کی بھی جاتی تو نہایت پیچیدہ ہوتی۔ میں نے پھر DGMI سے مشورہ کیا اور ان حضرات کے بارے میں تمام فوج سے منسلک دفاتر میں ایک سرکاری خط بھجوا دیا۔ اس میں لکھا کہ ان صاحب کی سیکورٹی کلیئرنس (security clearance) نہیں ہے اور جب تک یہ سیکورٹی کے لحاظ سے کلیئر نہیں کیے جاتے ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے۔ یہ خط میں نے GHQ کے تمام دفاتروں کے علاوہ (Pakistan Ordnance Factories) POF (Heavy اور HIT Industries Taxila)، کو بھی بھجوا دیے اور اس کی ایک کاپی برائے اطلاع وزارت دفاع کو بھی۔ ان کا فوج کے ساتھ کاروبار رک گیا۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ DGMI صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ جنرل مشرف صاحب بہت خفا ہیں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کہنے لگے میں نے انہیں بتایا تو انہوں نے کہا کہ شاید کو چاہئے کہ اپنے رشتے دار کو روکے، اسلحے کے کاروبار کرنے والی فرم کے مالک کا کیا قصور ہے، اس کو کیوں دبا یا جا رہا ہے؟ میں نے کہا کہ ان سے کہہ دیں کہ میں اس کے خلاف کارروائی کروں گا جس سے فوج سرکاری طور پر کاروبار کرتی ہے، اس کمپنی کے ملازمین سے مجھے غرض نہیں۔ انہوں نے پھر دوبارہ مجھے غصے سے بھرا پیغام بھجوایا کہ عجیب سر پھر انسان ہے۔ میرے دو سال وہاں رہتے میں فوج نے ان صاحب سے کوئی کاروبار نہیں کیا۔ میرے رشتے دار کی نوکری بھی چھوٹی۔ جب میں اس کرسی سے ہٹ رہا تھا تو وہ مجھ سے ملنے آئے اور معذرت کی کہ میں آپ کو سمجھ نہ پایا تھا۔ میں نے آتے وقت وہ خط جس سے ان کا کاروبار کا ہوا تھا منسوخ کر دیا۔ (جاری ہے)

”روشن خیال اعتدال پسندی کا نسخہ امریکہ کا تجویز کردہ تھا“

ذہنوں کو قابو کرنے میں ٹی وی چینلز آگے رہے۔ فرقہ وارانہ تنظیموں کو جہادیوں سے ملایا گیا۔ حقوق نسواں عورتوں کی آزادی قرار پائی۔ ملک میں پھیلتی فحاشی پر افسران کی تشویش کو مشرف نے ہنس کر ٹال دیا۔ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سردس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن ایون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

25 دسمبر 2003ء، قائد اعظم کی یوم پیدائش کا دن، میں گاڑی میں بیٹھالاہور کی طرف روانہ تھا، لاہور کے کورکمانڈر کا منصب سنبھالنے۔ ابھی کار راویلپنڈی سے نکلے نہیں تھی کہ دو زوردار دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ فون کیا تو پتا چلا کہ جنرل مشرف پر خودکش حملہ ہوا ہے۔ اللہ نے بچا لیا۔

CGS کی کرسی پر دو سال مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ سب کچھ ہی غلط ہوا۔ افغانستان پر غیر جانبداری کا جھانسنہ دے کر امریکہ سے گلے جوڑ کیا اور مسلمانوں کے قتل و غارت میں شامل ہوئے۔ نئے نظام کے وعدے پر آنے والا ڈکٹیٹر ریفرنڈم کے جعلی نتیجے کے بل بوتے پر پانچ سال کے لیے صدر بنا۔ نا اہل اور کرپٹ سیاستدانوں کی حکومت قائم کی گئی۔ امریکہ کے دباؤ پر کشمیر کو خیر آباد کہا۔ بلوچستان میں علیحدگی پسندی کی آگ لگائی گئی۔ کاروباری ٹی وی چینلز کھولنے کا فیصلہ کر کے قوم کی فکریں بھی منڈی میں رکھ دیں۔ پھر ”سب سے پہلے پاکستان“ کا دوغلا نعرہ لگایا اور دین کو روشن خیال اعتدال پسندی (enlightened moderation) کا نیا

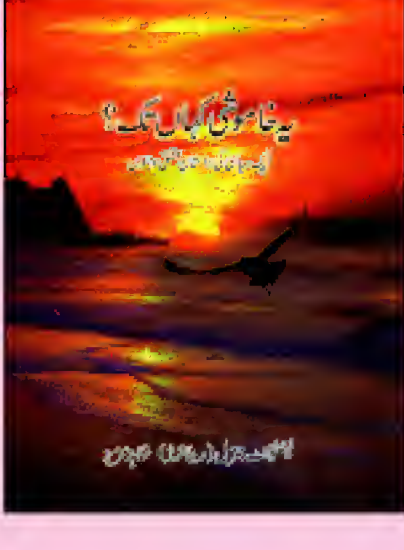
رنگ دیا۔۔۔۔۔ دین اکبری سے آگے نکل کر، دین پرویزی۔ پاکستان میں دین کا رجحان ختم کرنے کے لیے یہ نسخہ امریکہ کا تجویز کردہ تھا۔ قبلہ واشنگٹن کی طرف موڑنے کے بعد، آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں کو قابو کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تمام ٹی وی چینلز پیش پیش رہے۔ ایک سے ایک عالم اور فقیہ خریدے گئے۔ فرقہ وارانہ تنظیموں کو جہادیوں سے جا ملایا۔ پھر مثلاً کی جہالت کو مروڑ کر دین کو بدنام کیا اور اسے نیا رنگ دے کر، نئی اصطلاحات پیش کی گئیں۔ اسلام کے قواعد پر چلنے کو ”بنیاد پرستی“ کہا گیا، پھر اسے ”شدت پسندی“ سے جا ملایا۔ کچھ سچ میں تمام جھوٹ ملا کر، ڈھولک کی تھاپ پر ایک ناچتا ہوا معاشرہ سیدھی راہ بتائی گئی، جہاں ہر شخص کو اللہ کی رضا چھوڑ کر اپنی من مانی کی چھوٹ ہو۔ جب منزل دنیا کی راعنائیاں ہی ہو اور دھن دولت ہی خدا ہو، تو پھر یہی سیدھی راہ ہے۔

پھر عورتوں پر معاشرے میں ہوتے ہوئے مظالم کو دینی رجحان سے منسلک کیا گیا اور حقوق نسواں کو آزادی نسواں کا وہ رنگ دیا کہ عورت کو عزت کے مرتبے سے گرا کر نیم عریاں حالت میں لوگوں کے لیے تماشہ بنایا۔ ایک مرتبہ کورکمانڈر کا نفرنس میں کورکمانڈروں نے ملک میں پھیلتی ہوئی فحاشی پر اظہار تشویش کیا، تو مشرف صاحب ہنس کر کہنے لگے، میں اس کا کیا کروں کہ لوگوں کو ایک انتہا سے روکتا ہوں تو وہ دوسری انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔ مگر حقیقت مختلف تھی۔ صدر صاحب کی طرف سے باقاعدہ حوصلہ افزائی کی گئی اور پشت پناہی ہوئی تو بات یہاں تک پہنچی۔ اس سلسلے میں کئی NGOs بھی کام کر رہی تھیں اور بے بہا پیسہ خرچ کیا جا رہا تھا۔ یہ سب کی آنکھوں دیکھا حال ہے۔

جنرل مشرف خود کو معتدل مسلمان کہتے تھے اور شروع سے ہی اپنے آپ کو کمال اتاترک کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ایک لیڈر کی پہلی ترجیح اپنے ملک اور عوام کی زندگی اور املاک کو تحفظ دینا ہے اور مثلاً عمر جیسے لوگ دین کو دنیا کے مال و متاع اور زندگی پر ترجیح دیتے ہیں (انگریزی کتاب کا صفحہ 216)۔ صرف الفاظ میں تھوڑا اگھماؤ ڈال دیا کہ ”دین“ کی جگہ ”اپنے اصولوں اور روایات“ کے الفاظ استعمال کیے۔ مثلاً عمر کے اصول دین سے تھے، روایات اپنی تھیں۔ ان دونوں کو گڈنڈ کر دیا کہ مسلمان ناراض نہ ہوں اور مغربی معاشرہ، جن کے لیے یہ کتاب لکھی گئی، اصل مطلب سمجھ سکیں اور داد دیں۔ لب لباب وہی ہے کہ آخرت کو اس دنیا پر ترجیح دینا جہالت ہے۔ دو مختلف موقعوں پر، میری موجودگی میں، افسران سے خطاب کرتے ہوئے، ایک حدیث کے حوالے سے کہا ”اس ملک کے حالات کیسے سدھر سکتے ہیں جس کے لوگ اس دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہوں اور اگلی دنیا کی ہی فکر میں لگے رہتے ہوں؟ پھر ان کی یہ دنیا تو بربادی رہے گی“۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد، مارچ 2006ء میں، جن دنوں میں NAB میں تھا، امریکہ کے صدر حضرت جارج بش اسلام آباد تشریف لائے۔ رات کو پریزیڈنٹ ہاؤس میں کھانا ہوا اور ایک ثقافتی پروگرام پیش کیا گیا۔ پروگرام میں پاکستان کی تہذیب پر ایک نگاہ ڈالی گئی کہ ہماری تہذیب پر تاریخ کے کیا اثرات رہے۔ پہلی تصویر ہمارے معاشرے کی مونجھوڑارو کے ادوار کی پیش کی گئی۔ نیم عریاں لڑکیوں نے ناچ کر ہمیں سمجھایا کہ ہماری ثقافت کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ پھر بتایا گیا کہ الیگزینڈر کے آنے سے ہم نے ایک نیا رنگ حاصل کیا۔ اس رقص میں فیشن بھی بدل گیا اور لباس بھی مزید سکڑ گئے۔ پھر اگلا رقص عکاسی کرتا تھا، ہندوانہ تہذیب کی برہمنی کا، جس کا اثر ہماری تہذیب پر رہا۔ جب لباس غائب ہونے لگے تو میں ڈرا کہ آگے کیا آئے گا۔ لیکن پھر کافرستان کی رقاصائیں آگئیں کہ یہ اب بھی یہاں ناچتی ہیں۔ صرف اس ایک پیشکش میں کچھ ملبوس نظر آئے۔ اگلے رقص میں چھتریوں لیے برطانیہ کی میم صاحبائیں دکھائی گئیں، جنہوں نے چھتریوں کے علاوہ دستاں بھی پہنے تھے اور کچھ رومالیاں سی باندھی ہوئی تھیں۔ پھر اگلے رقص میں پاکستان کی موجودہ تہذیب کی عکاسی میں لڑکوں اور لڑکیوں نے مل کر، خفیف سے ملبوس میں جنسی کنائیوں (sexual innuendoes) سے بھرپور رقص پیش کر کے حاضرین کو محظوظ کیا۔ آخر میں ایک اور انوکھا رقص پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ وہ مستقبل ہے جس کی طرف ہم رواں ہیں۔ اسٹیج پر برہنہ جانوروں کی مانند بل کھاتے ہوئے اپنے مستقبل کی تصویر دیکھ کر جی چاہا شرم سے ڈوب مروں، مگر میری حیوانیت نے آنکھیں بند نہ ہونے دیں۔ بچپن میں سنا تھا کہ یہاں کبھی محمد بن قاسم بھی آیا تھا اور بہت سے بزرگان دین بھی، لیکن شاید ان کا کچھ اثر باقی نہ رہا تھا۔ جب ہم اپنا تماشہ دکھا چکے اور حضرت بش اٹھ کر جانے لگے تو تمام مجمع ان کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ پھر ہماری طرف سڑے تو سارا مجمع بھی ہنہر گیا۔ دانت نکال کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے، گھٹنے جھکا کر کوہے منکائے، دونوں ہاتھوں سے چنگیاں بجائیں اور سر ہلا کر تھوڑا اور منک کر دکھایا، جیسے کہہ رہے ہوں ”ہن نجو“۔ جس کی خوشی کے لیے ہم نے قبلہ بدل لیا، اپنی تاریخ جھٹلا دی، اپنا تمدن نوح کر چھینک دیا، وہ بھی لعنت کر گیا۔ (جاری ہے)

مُشرف نے مُلک میں سیکولر سوچ کو فروغ دیا

نصابِ تعلیم میں رد و بدل کیا گیا۔ جہاد والی آیات نکال دی گئیں۔ تعلیمی اداروں کو مغربی این جی اوز کی نگہداشت میں دیدیا گیا۔ جدید تعلیم کیساتھ دینی علوم کی میری تجویز ہنسی میں اڑادی گئی۔ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سر دس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہم کسی کے گھر کھانے پر مدعو تھے اور مدرسوں کا رنگ بدلنے پر بات ہو رہی تھی۔ جنرل مشرف بھی موجود تھے۔ ان کے سامنے میں نے کہا کہ ہم مدرسوں میں جدید تعلیم دلوانا چاہتے ہیں، بہت اچھی بات ہے لیکن ساتھ ساتھ اسکولوں میں بھی ایسی تعلیم دی جائے کہ دین کی صحیح سمجھ حاصل ہو سکے، ورنہ ہم معاشرے میں دو طرح کے افراد پیدا کریں گے اور ان کے بیچ ہمیشہ کچھاؤ رہے گا۔ پھر جب مدرسوں کے بچے جدید تعلیم بھی حاصل کر لیں گے تو یہ کچھاؤ اور بڑھ جائے گا، کیونکہ یہ پھر ملازمتوں کے لیے عام بچوں سے مقابلہ کریں گے۔ ہر دفتر میں دونوں مکتبوں سے آئے لوگ ہوں گے اور اگر وہ بن جائیں گے۔ یہ تاثر درست نہیں کہ مدرسوں میں جدید تعلیم پانے کے بعد یہ ”روشن خیال“ ہو جائیں گے۔ ہمیں چاہئے کہ مدرسوں اور اسکولوں کی تعلیم کو ایسے تشکیل دیں کہ دس یا پندرہ برسوں بعد دونوں تعلیمی نظام کسی حد تک متوازی آسکیں۔ پھر مسجد میں وہ نماز پڑھائے جس پر نمازیوں کا اتفاق ہو۔ یقیناً دین جس کے دل میں داخل ہو چکا ہو، وہ دین ہی کی راہ پر چلے گا، ورنہ دینی تعلیم حاصل کرنے والا بھی کاروباری سوچ کا مالک ہوگا، صرف دنیاوی فائدہ ڈھونڈے گا، چاہے مدرسے میں پڑھا ہو یا عام اسکول میں۔ اس شام کچھ اور بھی ایسے ہی روشن خیال مسلمان وہاں بیٹھے تھے۔ سب میری طرف پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک صاحب کہنے لگے۔ ”اسکولوں میں تو جو دین کی تعلیم دی جاتی ہے، کافی ہے، اس میں کیا خرابی ہے؟“ پھر کہا ”مجھے دین کے بارے میں جو جانتا چاہئے، جانتا ہوں۔“ مجھ سے رہا نہ گیا، آواز اونچی ہو گئی، کہا ”آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔“ جانتا تو میں بھی نہ تھا، مگر مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے میرا چیلنج قبول نہ کیا اور خاموش ہو گئے۔ میری بھی بچت ہوئی۔ پھر دوسرے بولے ”جنرل صاحب، ہم پہلے ہی ان مولویوں سے تنگ ہیں، اب آپ چاہتے ہیں کہ پورے ملک کو ہی مولوی بنادیں۔“ اس پر سب کھلکھلا کر ہنس دیے اور موضوع بدل دیا گیا۔ یہ صرف ”روشن خیال“ لوگوں کی سوچ نہیں ہے۔ مدرسوں کے عالم بھی نہیں چاہتے کہ اسکولوں میں دین کی صحیح تعلیم دی جائے، ورنہ دین پر ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس موضوع کو فرقوں کے جھگڑوں میں کچھ یوں الجھایا گیا ہے کہ آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے ”کس کا دین؟“ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں جتنا دکھایا جاتا ہے۔

جن دنوں میں بریگیڈ کمانڈ کر رہا تھا، ایک دینی عالم سے رابطہ رہا۔ ایک مرتبہ میں نے کہا کہ فوج بھی اللہ اکبر کے نعرے پر لڑتی ہے۔ ہم بھی لوگوں کو دین کے جذبے سے ہی سرشار کرتے۔ ہمیں چاہئے کہ فوج کے افسران کو بھی مناسب دین کی تعلیم دی جائے۔ کہنے لگے ”بریگیڈیئر صاحب یہ سوچ ٹھیک نہیں۔ بھلا بتائیں اگر میں آپ کا بریگیڈ لے کر میدان جنگ میں اتر جاؤں تو سب ہی کو مرادوں گا نا، کیونکہ مجھے لڑائی لڑنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ ہم دونوں کا اپنا اپنا کام ہے اور ہمیں چاہئے کہ مل کر کام کریں۔“

فوجی حکومت آج بھی تھی اور میں مری میں ڈویژن کمانڈ کر رہا تھا، ایک مرتبہ وزیر مذہبی امور کو ملنے ان کے دفتر گیا اور اس سلسلے میں بات کی۔ کہنے لگے ”اسکولوں کا معاملہ میرے نیچے نہیں آتا، یہ وزیر تعلیم کا دائرہ کار ہے۔“ میں نے کہا ”آپ ملک میں مذہبی امور کے وزیر ہیں، دیندار آدمی بھی لگتے ہیں، کیا آپ کو اس بات کی فکر نہیں کہ ملک کے سارے بچے اسکولوں میں دین کی سطحی ہی تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟ وزیر تعلیم کو دین سے کیا غرض؟“ وہ کچھ نہ بولے۔ میز پر پڑے کاغذوں کو تکتے رہے۔ میں نے جھنجھلا کر غصے سے کہا ”کیا آپ صرف عمرے اور حج کروانے کے لیے وزیر لگائے گئے ہیں؟“ اور اٹھ کر واپس آ گیا۔

جب حکومت دین سے منحرف کرنے والوں کی پشت پناہی کرنے لگے اور یہ تمام عوام پر اثر انداز ہو جائیں اور پھر اس سے آگے نکل کر کھلم کھلا اجتماعی طور پر اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر عوام کو اکسایا جائے تو یہ کسی کا ذاتی مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ پھر حکومت اللہ کے احکام کے خلاف محاذ آرائی کر رہی ہے۔ ایسے میں ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اُسے روکے۔ اس سیکولر سوچ کو جنرل مشرف نے شروع سے ہی ملک میں فروغ دیا اور آج بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے۔

یقیناً جہاد کا اعلان حکومت کا ذمہ ہے۔ کسی فرد یا تنظیم کو حق نہیں کہ اپنے طور پر جہاد کا اعلان کرے۔ لیکن اگر مسلمانوں کی حکومت کافروں کے ساتھ مل کر، ایک پڑوسی اسلامی مملکت پر حملے میں ان کی اتحادی بن جائے اور مسلمانوں کے قتل و غارت میں برابر کی شریک ہو تو مسلمانوں کے لیے اللہ کا کیا حکم ہے؟ ایک دن میں کسی کے گھر بیٹھا تھا۔ مشرف صاحب بھی آئے اور آتے ہی کہنے لگے ذرا قرآن تلائیے۔ ابھی ہم نئے نئے امریکہ کے اتحادی بنے تھے۔ پھر جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کہا کہ آیت نمبر 28:3 نکالیں اور پڑھیں۔ اتنا پڑھا گیا، ”مومنوں کو چاہئے کہ مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے (کچھ عہد) نہیں۔ ہاں اگر اس طریق سے تم ان (کے شر) سے بچاؤ کی صورت پیدا کرو تو مضا لفقہ نہیں۔“ کہنے لگے کہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے، آج ایسے ہی حالات ہم پر ہیں۔ میں نے بھی اس پر زیادہ غور نہ کیا اور درست ہی جانا، مگر دل راضی نہ تھا۔ پھر اور باتیں ہونے لگیں۔

کافی عرصے بعد سورۃ آل عمران کی یہ آیات پھر میری نظروں سے گزریں۔ اس سے پہلے کی دو آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی بادشاہت کا مالک ہے، وہی بادشاہت عطا کرتا ہے، وہی عزت اور ذلت دیتا ہے، ہر طرح کی بھلائی اُس ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ روز و شب وہ ہی ہم پر گزارتا ہے اور زندگی اور موت بھی وہی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے۔ اتنا کچھ بتانے کے بعد کہ ان تمام چیزوں کے طلبگار اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ہونا، اللہ نے فرمایا کہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ، مگر ان کے شر سے بچاؤ حاصل کرنے کی اجازت دی۔ پھر آخر میں یہ کہا ”اللہ تم کو اپنے (عذاب) سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف (تم کو) لوٹ کر جانا ہے۔“ یہاں شر سے بچاؤ میں اتنی چھوٹ نہیں کہ ہم مسلمانوں کے خون خرابے میں کافروں کے ساتھ بن جائیں۔ جس کے شر سے بچنے کے لیے کوئی ترکیب کرنی پڑے وہ یقیناً دوست تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں، اس جھگڑے میں غیر جانبدار رہنے تک کی چھوٹ میں مان سکتا ہوں اور ان دنوں جنرل مشرف کا اعلان بھی یہی تھا کہ ہم غیر جانبدار رہیں گے۔ بعد میں سرک سرک کر ان کے مکمل ساتھی بن گئے۔ بلکہ کھل کر کہتے تھے کہ اگر ان کا ساتھ نہ دیا تو ہماری معیشت کا کیا بنے گا؟ اور ان ہی کی نظروں میں عزت پانا نصب العین جانا۔ بہت فکر رہتی کہ مغربی ممالک میں ہمیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ یعنی عزت دینے والے بھی وہی اور رازق بھی وہی۔ آج بھی حکومت میں اور بہت سے مغربی ذہنیت رکھنے والوں میں یہی سوچ ہے۔

جن دنوں امریکہ عراق پر حملے کی تیاری کر رہا تھا تو امریکہ کے ایک اخبار میں خبر چھپی کہ حکومت نے ماہرین کی ایک ٹیم تشکیل دی ہے، جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ عراق پر قبضے کے بعد وہاں کے تدریسی نظام میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں کہ مغربی طرز زندگی کو اچھی نظر سے دیکھا جائے۔ to develop respect for western values)۔ امریکہ کے یہاں آنے پر ہمارے درجہ تعلیم پر بھی یہی سوچ اثر انداز ہوئی۔ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے بہانے NGOs کے ذریعے پیسے دیئے گئے، پھر اس زور پر نصابِ تعلیم میں رد و بدل کی گئی، تاکہ تعلیم کو سیکولر رنگ دیا جائے، حتیٰ کہ نصاب سے جہاد کی تلقین والی آیات بھی نکال دی گئیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ کتنے ہی ہمارے تعلیمی ادارے آج ان کی نگہداشت میں ہیں اور ہمارا مستقبل ان کی گود میں پلتا ہے۔

اس سیکولر سوچ سے مراد لا ذہنیت نہیں ہے، بلکہ دین اور دنیا کو علیحدہ کرنا مقصود ہے۔ یعنی دین ذاتی سطح تک رہے اور حکومت کے کسی فیصلے یا امر میں اس کی مداخلت نہ ہو۔ فرعون کا بھی موسیٰ سے یہی جھگڑا تھا۔ ”سب سے پہلے پاکستان“ کے نعرے میں بھی چھپا ہوا یہی رنگ ہے۔ جب دین کو انفرادی حیثیت دے دی گئی تو کہہ دیا کہ دین فرد واحد کا ذاتی مسئلہ ہے اور اجتماعی طور پر ہم صرف پاکستانی ہیں۔ اجتماعی طور پر، ایک قوم کی حیثیت سے، ہمیں دین سے کوئی غرض نہیں۔ ہم دنیا داری کے اصولوں پر چل کر قوم کو معاشی ترقی کی راہ پر لگائیں گے، جیسے دین غربت کی ہی راہ دکھاتا ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دین میں پیسہ کانے کے کچھ اصول ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو بکاؤ نہیں۔ دنیا داری کے اصولوں کے مطابق تو پیسہ ہی خدا ہے اور کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ رزق براستہ امریکہ آتا ہے، اس لیے قوم کا سجدہ و اشغٹن کو ہوگا۔ پھر قاعدہ یہ ٹھہرا کہ آپ انفرادی طور پر بیٹک اللہ کو سجدہ کرتے رہیں، حکومت کو کوئی اعتراض نہیں، جب تک آپ ان دو سجدوں کو تصادم کا رنگ دینے کی کوشش نہ کریں۔ پھر یقیناً ان کی نظروں میں امریکہ کی اسلام کے خلاف یہ جنگ ہماری جنگ ہی ہوگی۔ (جاری ہے)

”مشرق مغرب کی نقالی کو ترقی سے مجھے تھ“

سیکولر نظریات کے حامل تھے۔ انہوں نے واضح کر دیا تھا جو مجھ سے اختلاف کرے گا وہ وفاداروں کے بلند دائرے سے نکل جائے گا۔ قصیدہ خوانوں میں گھرے رہنا ان کی بڑی غلطی تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا

میں نے جنرل مشرف کو پاکستان کا وفادار ہی سمجھا۔ میرے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اپنی سوچ کے مطابق ملک کی بھلائی کیلئے نہیں کر رہے۔ ایک ملک کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملک کیلئے جو بہتر سمجھا کیا۔ یقیناً اپنی ذات کو ملک سے اوپر جانا، اور اپنے ذاتی فائدے کو ملک کا مفاد ظاہر کیا، مگر اس سے ہٹ کر تو کسی حکمران سے توقع بھی نہیں رکھتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں کوئی ایسا حکمران نصیب ہو سکے گا جو خود کو ڈبو لے، لیکن ملک کا مفاد نہ چھوڑے۔ ایسا فرشتہ کہاں سے لائیں گے؟ باتیں آسان ہیں، حقیقت ایسی نہیں ہوتی۔ انہوں نے بہت سی غلطیاں کیں، جن کو وہ کوئی نہ کوئی رنگ دے دیتے، ان کی وجوہات کہیں اور ٹھہراتے، کوئی بھی حکمران اپنی غلطیوں کو نہیں مانتا۔ قصور وار تو کوئی نہیں رہا، نہ فوجی حکمران نہ سیاسی۔ غلطی کا اقرار یہ بھی کبھی نہ کرتے۔ خود کو باصلاحیت حکمران ہی تصور کرتے۔ شاید حکمرانی میں آ کر انسان کی سوچ ایسی ہی ہو جاتی ہو۔

معاملہ سامنے آ یا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروں جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے کیلئے فوجی سہوتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک؟“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

فوج کا سربراہ بننے کے بعد ان کی پہلی غلطی کارگل کا معرکہ تھی۔ بہت بڑی غلطی کی۔ پھر برسوں بعد اپنی کتاب میں اس پر غلط بیانی کی۔ سچ بولنا بھی سیاسی خودکشی ہے۔ اتنے سچ کی بھی میں حکمران

سے توقع نہیں رکھتا۔ سیاسی قائدین سے تو ہر گز نہیں۔ حکومتیں ہمیشہ وہی کہتی ہیں جس میں مصلحت اندیشی ہو۔ ان سے بچوں کی طرح کے سچ کی امید نہ رکھیں۔ وہ تو آج کا عام آدمی بھی نہیں بولتا، سیاست دانوں سے ایسی توقع کیوں؟ کچھ نہ کچھ مکاری ہماری سیاست کا حصہ ہے۔ اگر آپ یوں مان لیں کہ ”سب سے پہلے میں، پھر پاکستان“ تو مشرف صاحب اتنے برے بھی نہ تھے۔

کوئی بھی حکمران تمام باتیں تمام لوگوں سے نہیں کہہ سکتا۔ اور میں نے یہی دیکھا کہ اس سطح پر جھوٹ اور سچ کوئی معنی بھی نہیں رکھتے۔ صرف بات مناسبت کی منطق پر کہی جاتی ہے۔ ہماری سیاست میں جھوٹ کو جھوٹ نہیں کہتے، سیاست کہتے ہیں۔ پھر ہماری تاریخ میں سچائی اور لیڈری کا جوڑ کہاں رہا؟ یہ سب خیالی باتیں ہیں، میرے جیسے بے وقوفوں کی ذہنی معذوریوں۔

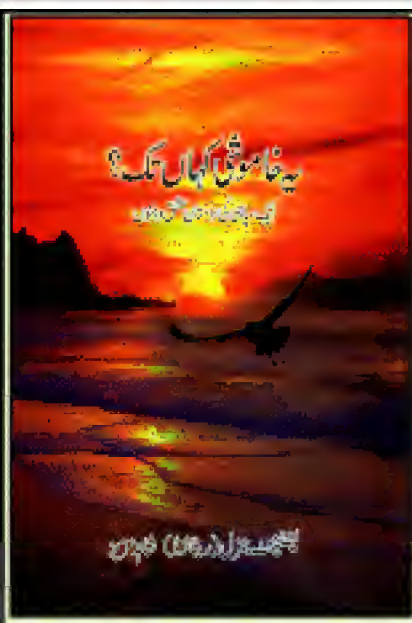
عام تصور سے ہٹ کر، یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر حکمران نہایت خوف زدہ شخص ہوتا ہے۔ وہ اس اونچائی پر بیٹھا ہوتا ہے جہاں سے ذرا سی جنبش اسے گرا سکتی ہے۔ وہ اپنی بلندی برقرار رکھنے کیلئے کسی مل جل کو پسند نہیں کرتا۔ درخت کا تنہا مضبوط ہوتا ہے، قوم کی مڈل کلاس میں سے اونچی ٹہنی، جس پر یہ حکمران چڑھ بیٹھتے ہیں، سب سے کمزور ہوتی ہے۔ غریب عوام جو جڑوں کی طرح زمین میں دھنسے ہیں، اس اونچائی سے انہیں نظر نہیں آتے۔ بھول جاتے ہیں کہ جس شاخ پر بیٹھے ہیں، اس کی ساری طاقت زمین میں دبی جڑوں سے ہی آتی ہے۔ یہی مزدور اور کسان اور سپاہی اس ملک کو اپنے خون پسینے سے بناتے اور اس کا دفاع کرتے ہیں۔ اگر یہ احساس زندہ رہتا تو شاخ سے کبھی نہ گرتے۔

جنرل مشرف نے دوسرے، میری موجودگی میں، فوج کے سینئر افسران کو خطاب کرتے ہوئے وفاداری کی اہمیت پر بات کی۔ کہنے لگے وفاداری کئی قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ذاتی وفاداری (Personal loyalty) کہ آپ میرے دوست ہیں اور مجھ سے اس بنا وفادار ہیں۔ اچھی بات ہے۔ دوسری یہ کہ آپ کی وفاداری ادارے کے ساتھ ہے۔ (Institution loyalty) جیسے فوج یا ملک سے وفاداری۔ قابل احترام ہے۔ مگر میں جس وفاداری کی قدر کرتا ہوں، وہ ہے خیالات کی وفاداری (Loyalty of ideas) اگر میری اور آپ کی سوچ ایک ہے تو پھر بے وفائی کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ انہوں نے یہ بات سب پر واضح کر دی کہ اگر کوئی مجھ سے اختلاف کرے گا، تو وہ وفاداروں کے بلند دائرے سے گر جائے گا۔ اس کے بعد اگر لوگوں کو اختلاف بھی ہوتا، تو خاموش رہنا مناسب سمجھتے۔ یہی ان کی منشا تھی۔

چونکہ ان کے روز و شب انہی وفاداروں کے ساتھ گزرتے جو ان جیسی سوچ رکھتے، یا کم از کم ویسی ہی سوچ ظاہر کرتے تو مشرف صاحب اسی سمت میں چلتے رہے۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ متضاد سوچوں کو بھی سننا چاہئے، ذہن ماؤف نہیں ہوتے۔ کٹھ پتلی قصیدہ خوانوں میں گھرے رہے اور ان ہی میں خوشی ڈھونڈی اور تسکین پائی۔ آسانی سے لوگوں کے بہکاؤ میں آ جاتے۔ مذہبی رجحان نہیں تھا، سیکولر اور آزاد خیال نظریہ رکھتے تھے فقط دنیا داری کے قائل تھے، اس وجہ سے مغربی طرز پر معاشرے کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ اسے ترقی سمجھتے۔ (جاری ہے)

”مشرف خود کو ملک کیلئے ناگزیر سمجھتے تھے“

ان کا خیال تھا وہ بڑے تو ملک ڈوب جائیگا۔ افغانستان پر امریکی قبضے کیخلاف اٹھنے والوں کو القاعدہ کا ساتھی اور دہشت گرد کہا جاتا۔ مشرف مسلمانوں کے قاتل کے طور پر یاد رکھے جائینگے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے

جہاں تک نام نہاد ڈیموکریسی کا تعلق ہے۔ اس پر ویسے ہی نہ میرا اعتقاد تھا اور نہ ہے۔ جنرل مشرف نے نیا شفاف نظام تشکیل دینا تھا، نہیں دیا۔ کیا کوئی پیچیدگیاں تھیں؟ میں کہہ نہیں سکتا۔ مجھے کوئی ایسی مجبوری نظر تو نہیں آئی۔ نظام پر اتنا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، نظام چلانے والے پر زیادہ انحصار کرتے۔ اسی لئے نظام کو پیچھے بڑھا کر ضروری سمجھا، کہ میں سب سنبھال لوں گا۔ پھر ہر ڈکٹیٹر کی طرح وہ بھی یہی سمجھتے تھے اگر وہ منظر سے ہٹ گئے تو ملک ڈوب جائے گا۔ جب نظام درست نہیں کیا، تو یقیناً حکومت ڈوبے گی اور آخر کار ملک بھی۔ پھر ہماری تاریخ کا ہر حکمران اپنی کرسی بچانے کیلئے جو بھی کر سکتا ہے، کرتا ہے۔ تو جب نظام لڑکھڑانے لگا، انہوں نے بھی جو کر سکتے تھے کیا۔ وہ چونکہ زیادہ طاقتور تھے، کچھ زیادہ ہی کر گئے۔

بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن ایون (9/11) کے لئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

افغانستان پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ جوان کے خلاف اٹھتا اسے القاعدہ کا ساتھی اور دہشت گرد کہا جاتا۔ دہشت گردی کسے کہتے ہیں، کوئی نہ پوچھتا۔ بس کہہ دیا کہ سیاسی مفاد کی خاطر عوام کو نشانہ بنانا، دہشت گردی ہے۔ اور جو امریکہ اپنے مفاد کی خاطر افغانستان کے بے گناہ شہریوں کا قتل عام کر رہا تھا، اسے

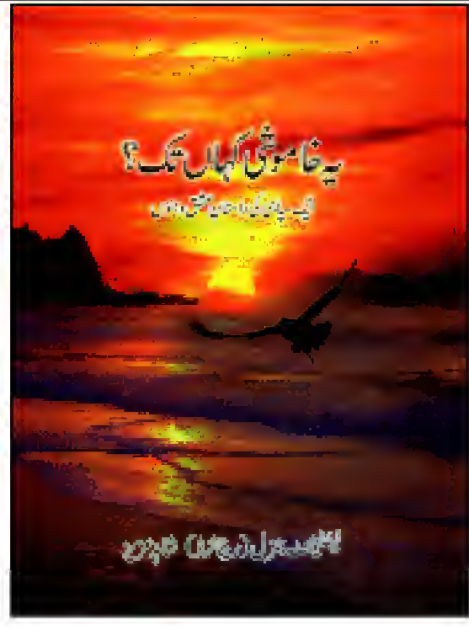
دہشت گردی کے خلاف جنگ قرار دیا۔ اور جو افغان اپنی آزادی کیلئے لڑ رہے تھے، وہ دہشت گرد ٹھہرے۔ امریکہ کا ساتھ دینے والے مسلمان ہوش مند کہلائے۔ اس سے اختلاف رکھنے والے جاہل، شدت پسند۔ جیسے ہماری تاریخ کا ہر فوجی حکمران ایک بڑے گناہ کا بوجھ لئے کھڑا ہے، مشرف صاحب مسلمانوں کے قاتل کے طور پر یاد کئے جائیں گے۔

یہ احساسات ان دنوں بھی میرے دل میں تھے لیکن میں گنتی کے چند لوگوں میں سے تھا جو امریکہ کا ساتھ دینے کے حق میں نہیں تھے۔ کچھ تو شروع میں تاثر یہ رہا کہ ہم غیر جانبدار ہیں۔ کچھ فرقہ وارانہ دہشت گردی اور شدت پسند رجحانات سے سب ہی خائف تھے۔ میں بھی۔ پھر میرے CGS رہنے کے دوران نہ ہی FATA میں کوئی ایسے بڑے آپریشن شروع ہوئے تھے اور نہ ہی امریکہ کا گھناؤنا کھیل اس طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ ان دنوں جنرل مشرف بھی ملک میں خاصے مقبول تھے۔ میڈیا میں بھی امریکہ کا ساتھ دینے کو ان کی دانائی ہی قرار دیا جاتا۔ کبھی لگتا شاید میرا ہی نظریہ شدت پسندی کی طرف مائل ہے۔

2010ء تک توئی وی چینلز پر بھی امریکہ کے اتحادی ہونے پر کوئی آواز نہیں اٹھتی تھی۔ آج بھی بہت سے لوگ یہی سوچ رکھتے ہیں کہ ہماری بھلا امریکہ کی پالیسیوں پر چلنے میں ہی ہے۔ بس ڈرون حملوں، ہماری چوکیوں پر فضائی حملوں اور بلیک وائر جیسی نئی سیکورٹی کمپنیوں کی آڑ میں ان کی خفیہ ایجنسیوں کی کارروائیوں پر کچھ تشویش ہے۔ وہ بھی اب شروع ہوئی ہے۔ افغانستان میں ان کا اتحادی ہونے پر پاکستان کو خیر آباد کہہ کر ہندوستان سے کاروباری مراسم بڑھانے پر آج بھی خاموشی رہتی ہے۔ میرے بارے میں کچھ لوگوں کو خدشہ تھا کہ کہیں 2004ء کی پروموشن میں جنرل نہ بن جاؤں اور ان کو موقع نہ ملے۔ میرے خلاف پروپیگنڈا بھی ہوتا رہا، کچھ سازشیں بھی۔ مگر میں ان سب چیزوں سے دور بٹنا چاہتا تھا۔ اگر مجھے ترقی کی اتنی خواہش ہوتی تو میرے لئے صدر صاحب کی ہاں میں ہاں ملانا کوئی ایسا کٹھن مسئلہ تو تھا نہیں۔ سب ہی کر رہے تھے۔ پھر بہت سے دوست مجھے بھی یہی سمجھاتے رہے۔ مگر میں ہی ہر جگہ الجھتا رہتا۔ ترقی کی خواہش کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر اس ماحول میں مجھے مزید پروموشن لینے کی آرزو نہیں رہی تھی۔ پھر یہ طور طریقے میری طبیعت کو کبھی موافق نہیں آئے۔ جب وہ کورکمانڈر منگلا تھے تو ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میری تایا زاد بہن کی بیٹی کی منگنی ان کے بیٹے سے ہوئی۔ ان دنوں میں MO میں بریگیڈیئر تھا۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ اس شادی سے ہماری رشتہ داری ہوئی۔ پھر فوجی حکومت قائم کرنے میں میرا خاصہ کردار رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے بنائی عمارت کی اینٹیں اکھیر تا بھی عجیب سا لگتا ہے۔ جیسے بے وفائی کی حد چھو لی ہو۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا رہتا، لیکن ایسے موقعوں پر کوئی سرکاری بات نہ ہوتی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے۔ لیکن میں نے کبھی ان مراسم کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ جن دنوں میں CGS تھا، میجر جنرل طارق مجید صاحب MI کے سربراہ تھے۔ (بعد میں جنرل بنے اور چیئر مین جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی نامزد ہوئے) ایک دن مجھے بتایا کہ جنرل مشرف نے ان سے کہا تھا کہ فوج سے ذرا تخمینہ (Pulse) لیں، کہ لوگ کس کو وائس چیف کے عہدے پر دیکھنا پسند کریں گے۔ کہنے لگے ”آپ جانتے ہیں فوج میں کیا سوچ ہے؟ تقریباً متفقہ (unanimous) خیال ہے کہ آپ کو وائس چیف ہونا چاہئے۔“ یہ اللہ کا مجھ پر بہت بڑا کرم تھا کہ اس نے مجھے عزت دی۔ مگر وائس چیف کے عہدے پر رہ کر میرے لئے اپنے چیف کے ساتھ کام کرنا نہایت دشوار ہو جاتا، اور ان کے لئے بھی۔ یقیناً یہ فوج کے نظم و ضبط کیلئے مناسب نہیں تھا کہ چیف اور وائس چیف میں تنازع رہے۔ وفاداریوں کا مسئلہ بھی اٹھ جاتا۔ یہ مجھے قبول نہیں تھا۔ فوج جیسے اہم ادارے کو باہمی جھگڑوں میں نہیں الجھایا جاسکتا۔ ان حالات میں، اس طرح ملک تباہ ہو سکتا تھا۔ میرے لاہور جانے سے پہلے ایک مرتبہ میجر جنرل ندیم تاج (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے۔ اور ISI کے سربراہ رہے)، جو ان دنوں چیف کے پرسنل اسٹاف افسر تھے، کہنے لگے کہ وائس چیف کے عہدے پر پروموشن کیلئے آپ کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ چیف کو ایسا مشورہ ہرگز نہ دیں، کیونکہ میں اس عہدے کیلئے موزوں نہیں ہوں۔ ایک تو کوئی افسر مجھ سے سینئر ہیں، دوسرے میری ان سے رشتہ داری بھی ہے اور پھر وہ خود بھی مہاجر خاندان سے ہیں اور میں بھی، جب کہ فوج زیادہ تر پنجاب سے ہے۔ مجھے پروموشن کرنا ان کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ ایسا تاثر قائم ہوگا کہ فوج میں زیادہ تر لوگ ان کے طرف دار نہیں۔ پھر جب دسمبر 2003ء میں، میں یہاں سے تبدیل ہو کر لاہور جانے لگا تو انہوں نے مجھے اور انجمن کو اپنے گھر چائے پر بلایا۔ باتوں باتوں میں پوچھنے لگے کہ تمہارا کیا مشورہ ہے، کس کو وائس چیف بناؤں؟ کچھ نام لئے اور وجوہات بتائیں کہ ان کو نہیں بنا سکتا، میں نے کہا پھر آپ کے پاس سب سے موزوں انتخاب لیفٹیننٹ جنرل احسن سلیم حیات کا ہے، انہیں بنا دیں۔ میں نے کوئی ایسی جھلک بھی نہیں دی، جس سے ان کو یہ غلط فہمی ہو کہ میں بھی امیدوار ہوں۔ یہ باتیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعد میں ان کو ایک نیا رنگ دیا گیا۔ (جاری ہے)

دلبرداشتہ ہو کر کی باراستغنیٰ دینے کا سوچا؟

یہ خیال حاوی رہا کہ استغنیٰ دیکر ہیر تو بن جاؤں گا لیکن حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئیگی۔ یہ بھی سوچتا کہ فوج مشرف کی ہے اور نہ میں ان کا ذاتی ملازم۔ مجھے اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، با کردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سردس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے لئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں مکمل کرکلہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

سی جی ایس کے دو سال کا عرصہ ذہنی کوفت کا گزرا۔ یقیناً جنرل مشرف کے مقاصد اور طور طریقوں سے مجھے اختلاف رہا اور جو کہہ سکتا تھا کہہ دیتا، کبھی ضمیر کے برخلاف ہاں میں ہاں نہیں ملائی، مگر دل پر ہر وقت ایک بوجھ سارہتا۔ جی ایچ کیو کے آخری ایام میں ایک دن دفتر میں بیٹھا تھا، سامنے لان میں، سردیوں کی گرم دھوپ میں، مالی گلابوں کی کٹائی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا کھڑکی سے اُسے دیکھتا رہا۔ دل میں خیال آیا کہ اس کی زندگی کتنی پرسکون ہے، کاش، میرا بھی اتنا سہل کوئی کام ہوتا جو دل و دماغ پر بوجھ نہ بنتا، دل کو یوں نہ مروڑتا، بس مالی جیسی تنگدستی مجھے نہ ملتی۔ کہتے ہیں کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہے جب دل سے نکلی بات پوری ہو جاتی ہے۔ آج پانچ سال سے یہی کر رہا ہوں۔ مگر دل جب بچھ چکا ہو، اُسے کیسے بہلاؤں؟

اپنی ندامت میں اللہ کو بہت قریب پاتا۔ ہر وقت اُس کے خیال سے دل ڈوبا رہتا۔ اس کی محبت ڈھونڈتا اور خود کو اس قابل نہ پا کر بہت پریشان اور پشیمان رہتا۔ کس سے کہتا؟ وہی ایک سننے والا تھا۔ اُسی کو پکارتا، کوئی جواب نہ پاتا۔ کبھی پرانے فلمی گیت سنا تو اُن میں بھی اللہ کو پاتا، روتا۔ ان ہی دنوں، جب افغانستان پر امریکہ کے گولے پھٹ رہے تھے اور ہم ان کے طاقتور بھائی، اپنی لالچ سیٹھ، دشمن کی گود میں بیٹھے تھے، ایک دوست نے شاہنواز زیدی صاحب کی کتاب ”آئینہ دار“ مجھے دی۔ منظوم پیش لفظ میں لکھا تھا:

میں نابینا مصور ہوں

جو دونوں ہاتھ آگے کر کے چلتا ہے

جو خوابوں میں بھی جا کر بندگیوں میں نکلتا ہے

کہ اُبلے منظروں کی دوسری جانب جو اندھے غار ہیں

اُن میں مری آنکھیں اڑھکتی ہیں!

ان کے الفاظ میں دل ڈوب کے رہ گیا۔ پھر نظم ”مزار شریف“ پڑھنی شروع کی۔ تصویر کشی ایسی تھی جیسے آنکھوں کے سامنے آئینے میں منظر بکھرا ہو۔ جب آخری سطور پر پہنچا، آئینے میں اپنی شکل دکھائی دی،

”اب کی بار ابا بیلوں نے

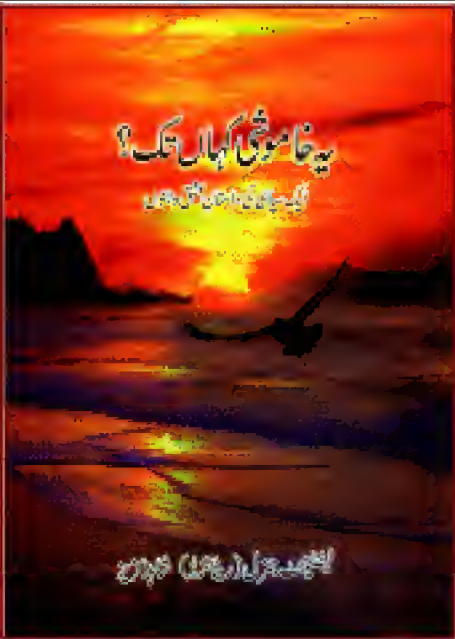
پھر آنے میں دیر لگا دی!“

تو پھوٹ پڑا۔ کمرے میں کچھ اور گھروالے بھی بیٹھے تھے۔ اٹھ کر غسل خانے میں جا چھپا۔ دیر تک روتا رہا۔ رات بھر یوں ہی گزری۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ ناشتے کی میز پر سب ہی بیٹھے تھے، پرانا نا بھی، نانا بھی، میرے بچے بھی اور نواسہ بھی۔ ناشتے کے بعد نہ جانے کیوں میرے من سے نکلا کہ جب ریٹائر ہو جاؤں گا تو اللہ میاں کو سیلوٹ کروں گا اور کہوں گا ”میرے لیے کیا حکم ہے؟“۔ وہ کہے گا ”جب تجھے اتنا بڑا افسر بنایا، تب کہاں تھا؟ اب کوڑے کی نوکری سے نکل کر کیا پوچھتا ہے کہ کیا حکم ہے؟“ یہ کہتے ہوئے پھر سے آنکھیں بھرا آئیں اور وہاں سے ہٹ گیا، مگر سب نے دیکھ لیا تھا۔ ان دنوں کچھ دوستوں سے اس سلسلے میں بات بھی ہوتی۔ سب فوجی ہی تھے۔ سب یہی کہتے کہ میری سوچ ٹھیک نہیں۔ ایک جنرل صاحب نے کہا کہ قائد اعظم کون سے اتنے مذہبی انسان تھے، مگر اللہ نے ان سے کتنا بڑا کام لیا۔ یہ اللہ کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ اللہ ہی نے مشرف صاحب کو بھی اس کرسی پر فائز کیا ہے تو کیا تم اللہ سے ناراض ہو؟ پھر اپنی ذہنی پریشانیوں کو دور کرنے، ان ہی احباب کی رہنمائی میں، کچھ ایسے لوگوں سے بھی رابطہ رہا جو مرید تھے اُن کے، جنہیں ولی اللہ کا رتبہ دیا جاتا تھا۔ یہ تمام مشرف صاحب کی شدت سے حمایت کرتے۔ میں ان میں سے کسی سے منسلک تو نہیں رہا، مگر اُن کی باتوں کا اثر یقیناً مجھ پر رہا۔ پھر ریٹائرمنٹ کے بعد جب ان سے ملا تو کچھ ایسی باتیں ہوئیں اور 2006ء کے جج کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ میں اس راہ سے ہٹ گیا۔ کئی بار دل میں خیال اُبھرا کہ فوج چھوڑ دوں، مگر میری منظموں نے اس خیال کو دبا دیا۔ والد صاحب نے بھی فوج سے استغنیٰ دیا تھا، اس کے بعد بری معاشی حالت سے گزرے۔ دوسرے میں بھی ایسا کر چکا تھا۔ اگر اللہ نے نہ بچایا ہوتا تو نہ جانے بچوں کا پیٹ کیسے پالتا۔ کبھی یہ خیال آتا کہ میں استغنیٰ دے کر ہیر تو بن جاؤں گا لیکن کسی چیز پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کچھ بدلے گا تو نہیں۔ میرے رہنے سے ان چیزوں میں کچھ رکاوٹ تو ہے۔ 1971ء کے حالات میں مشرقی پاکستان میں جنرل صاحب زادہ یعقوب خان کے بارے میں بھی خیال آیا۔ انہوں نے بہت اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا تھا اور غلط لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا، استغنیٰ دے دیا۔ مگر حالات اور بگڑ گئے۔ کبھی یہ سوچتا کہ فوج مشرف کی تو نہیں، میں اُن کا ذاتی ملازم تو نہیں کہ چھوڑ دوں۔ فوج کیلئے کام کرتا ہوں اور کرتے رہنا چاہئے، بولتے رہنا چاہئے۔ یہی میری فوج سے وفاداری ہے۔ خود تو کوئی غلط کام کرنے کی مجبوری نہیں اور نہ ہی کیا۔ جو برا سمجھتا ہوں اسے روکوں گا۔ اس کی دنیا دار پالیسیوں سے اختلاف ضرور ہے اور کرتار ہوں گا۔ میں چپ تو نہیں رہتا۔ چلا گیا تو فوج کو کیا ملے گا۔ پھر کبھی خیال آتا کہ آخر میں ہی اتنا ناراض کیوں ہوں، باقی سب تو اطمینان سے ہیں۔ کیا میں نے کہانیوں کے کردار ڈان کو یوٹے (Don Quixote) کی طرح اپنے مد مقابل تصوراتی حریف کھڑے کر لیے ہیں، کیا میرا نا تا حقیقت سے کٹ گیا ہے؟ کبھی سوچتا کہ اگر چھوڑ کر چلا گیا تو شاید اللہ ناراض ہو جائے کہ تمہیں دو بار بھاگنے سے بچایا کہ تم سے کچھ کام لینا تھا اور آج وقت آیا تو تم چھوڑ بھاگے۔ سوچا شاید آگے کچھ ہونا ہو، میرا کوئی کام ہو جو مجھے ابھی نظر نہیں آتا۔ دل میں ایک کشمکش چلتی رہی۔ خود فریبیوں میں ڈوبا رہا۔ ایسا کچھ بھی نہ ہوا کہ میں کچھ کرتا۔ خود کو ضائع ہی کیا۔ (جاری ہے)

مشرف نے نیٹ کو اپنے ساتھیوں کی خلاف کارروائی سے روک دیا تھا

حکومت غیر مستحکم ہونے کے خطرے پر چھیڑ چھاڑ نہیں چاہتے تھے۔ نیٹ میں بھی شفافیت نہیں تھی۔ میں نے ہر ہفتے کانفرنس کے ذریعے کیسوں کے فیصلے شروع کئے۔ جن کی ویڈیو ریکارڈنگ کی جاتی تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



ریٹائرمنٹ کے بعد اکتوبر 2005ء میں ہم راولپنڈی میں اپنی بیٹی کے گھر آ گئے، کوئی اور ٹھکانا تو تھا نہیں۔ اپنا گھر ابھی بن رہا تھا۔ دوسرے ہی دن مجھے صدر صاحب نے اپنے دفتر بلوایا۔ کہنے لگے تم قومی احتساب بیورو (NAB) کو سنبھال لو۔ ہماری لاہور کی گفتگو کو فارمل (formal) نوعیت دی، اور کہا، ”مجھے تم سے صرف ایک بات کہنی ہے۔ میری حکومت میں کچھ ایسے لوگ ہیں، مثلاً فیصل صالح حیات صاحب، جن کی کرپشن کے کچھ پرانے قصے ہیں۔ تم ان پرانے قصوں کو فی الحال نہ چھیڑو، میری حکومت غیر مستحکم ہو جائے گی، ملک کا مالی دیوالیہ نکل جائے گا۔ اگلے سال الیکشن ہیں، اس کے بعد دیکھ لینا۔“ میں نے یہی مناسب سمجھا اور حامی بھری۔ گنتی کے چند ہی تو لوگ تھے، جن کے پرانے قصے تھے، میرے ذہن میں صرف تین یا چار نام آئے۔ اور صرف پرانے قصے ہی چھوڑنے تھے، اب مزید گڑبڑ کی گنجائش تو دینی نہیں تھی۔ پھر ایک سال ہی کی تو چھوٹ تھی، اگلے الیکشن کے لئے تو دیے بھی ان کا وعدہ تھا کہ صرف صاف لوگ آگے آئیں گے۔ ملک میں اتنے بڑے پیمانے پر کرپشن ہو رہی تھی، میں نے سوچا، جو کر سکتا ہوں اتنا تو کروں۔

ملک میں پھیلی ہوئی کرپشن کا نہ کوئی تخمینہ ہے اور نہ صحیح طور پر اسے معلوم کرنے کے لئے کوئی ریسرچ کی گئی ہے۔ بس سطحی سی کتابی باتیں ہیں۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ایک انٹرنیٹ کرپشن اسٹریٹیجی بنائی گئی تھی، جسے کیبنٹ نے منظور کیا تھا، مگر اس پر کوئی عمل نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی کوئی کسی کو پوچھتا۔ صرف سیاسی دکھلاوے کے طور پر اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔ NAB چھٹیاں لکھتی رہتی، معاملات جوں کے توں رہتے۔ حکومت کے تمام محکموں کا انٹرنیٹ کرپشن کے ہر سلسلے پر نال منول کارویہ رہتا۔ مثال کے طور پر، اس پالیسی کے تحت ایک پبلک پروکیورمنٹ ریگولیٹری اتھارٹی (Public Procurement Regulatory Authority) قائم کی گئی، جس کے ابتدائی قانون میں، NAB کے اصرار پر، یہ لکھا گیا کہ ان قوانین پر عمل درآمد نہ کرنا جرم قرار پائے گا۔ پھر جب یہ قوانین آخری شکل میں آئے تو لکھا تھا، ”ان قوانین پر عمل درآمد نہ کرنا کوئی جرم نہیں ہوگا۔“ عجب تماشا تھا۔ بڑی مشکل سے اس لائن کو کنوایا گیا۔ آج بھی اس قانون پر عمل کرنا لازم نہیں۔ یہ کرپشن کی روک تھام کی جانب حکومت کے عہدیداروں کا رویہ ہے۔ کہتے تھے آپ گورنرس کو نہیں سمجھتے، مداخلت سے ملک کا نظام درہم برہم ہوگا۔

جب NAB میں پہنچا تو کچھ دن تو حالات کا جائزہ لیا۔ تمام صوبوں کے دفاتر گیا۔ سب کے تاثرات سنے اور ادارے کی ترجیحات اور کارروائی کے طریقوں میں کچھ ترامیم مناسب سمجھیں۔ چونکہ کرپشن بہت وسیع پیمانے پر ہو رہی تھی، اسے ختم کرنے کی کوشش بھی اس ہی طرح پھیل چکی تھی۔ ہزار فائلیں کھلی ہوئی تھیں، اور تفتیش برسوں چلتی رہتی۔ اتنے زیادہ کیس کھل چکے تھے کہ کئی ڈائریکٹر کے درجے کے لوگ بھی براہ راست تفتیشوں میں مصروف تھے۔ جس کسی کی شکایت آتی، ایک نیا کیس کھل جاتا۔ پھر وہ برسوں سولی پر لٹکا رہتا۔ اس قدر کرپشن کے معاملات زیر تفتیش تھے کہ اس تنظیم کے بس میں نہ تھا کہ ان کو سنبھال سکتی۔ کوئی ترجیحات نہیں تھیں، جس کی چاہے فائل اوپر کر دو، جس کی چاہے دبی پڑی رہے۔ کام کی زیادتی ہر چیز پر اپنا رنگ چھوڑتی۔

اس پھیلے ہوئے کام کو قابو میں کرنے کے لئے، میں نے اپنی ایک کانفرنس میں کہا کہ تو جیسا طین پر مرکوز رکھیں، گناہ گاروں پر نہیں۔ یہ اس سلسلے میں بھی کہا کہ ایک سابقہ وزیر کا کیس تھا، جن پر الزام تھا کہ انہوں نے کچھ سرکاری گاڑیاں اپنی زمینوں پر استعمال کے لئے رکھی تھیں۔ شاید کل چار یا چھ لاکھ روپے کے خورد برد کا معاملہ تھا۔ میں نے کہا کہ اگر آج کل کے ماحول میں کوئی وزیر صرف گاڑی ہی ناجائز استعمال کر رہا ہے اور اس کے خلاف اس کے علاوہ کوئی شکایت نہیں، تو اس سے زیادہ صاف ستھرا وزیر آپ کو کہاں سے ملے گا؟ ملک میں بہت بڑے پیمانے پر کرپشن ہو رہی ہے، چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں الجھنا بے مقصد ہے۔

NAB کے اعلیٰ عہدیداران سے مشاورت کے بعد، ادارے کی کارروائیوں میں چند ترامیم کیں۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اگر حکومت کے کارندے کرپٹ ہوں تو ایک شہری کے لئے، جو ان سے کوئی واسطہ رکھے، کرپشن سے بچنا ممکن نہیں، ورنہ اس کا کوئی کاروبار چل نہیں سکتا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ہمارا فوکس (focus) بل اعموم حکومت کی مشینری پر ہی رہنا چاہئے۔ عام شہریوں کے صرف وہ کیس دیکھے جائیں، جہاں مجموعی طور پر عوام کو لوٹا گیا ہو، یا بہت بڑے پیمانے پر پیسے کا غبن ہوا ہو۔ یہ بھی فیصلہ کیا کہ حکومت کے عہدیدار چوری کا پیسہ لوٹا کر کیس ختم نہیں کروا سکیں گے۔ انہیں لامحالہ سزا کے لئے کورٹ میں لے جایا جائے گا۔ اس فیصلے سے کافی حد تک کام سنبھل گیا۔

ایک حد بھی لگائی کہ ایک تفتیشی ٹیم ایک وقت میں کتنے کیس دیکھ سکتی ہے۔ ساتھ ہی تفتیشی ٹیم کے لئے وقت بھی مقرر کر دیا گیا کہ اتنے عرصے میں تفتیش مکمل کر لے۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ جس کسی پر الزام ہو، وہ برسوں ہوا میں نہ لٹکا رہے۔ پھر کچھ ترجیحات متعین کیں، جن کے مطابق یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کون سے کیس کی تفتیش شروع کی جائے۔ پہلی ترجیح پر حکومت کے بڑے عہدیدار ان تھے، پھر وہ لوگ جنہوں نے بڑے پیمانے پر عوام کو لوٹا ہو۔ عہدے اور چوری کے الزام کے حجم کو مد نظر رکھتے ہوئے پندرہ یا بیس ترجیحات کی ایک لسٹ تیار کی اور تمام دفاتر کو کچھوا دی گئی۔ ایک مخصوص تعداد میں کیسوں کی ایک وقت میں تفتیش ہو سکتی تھی اور قطعی طور پر ان ہی ترجیحات کے مطابق، جب گنجائش ہو۔ پھر کوئی نیا کیس اس ترجیح کے مطابق کھولا جائے۔ اگر دیئے ہوئے عرصے میں کوئی تفتیش مکمل نہ کی جاسکتی، تو تفتیشی افسر اور اس کے بالا عہدیداروں کو اس کی وجوہات لکھ کر بیان کرنا پڑتیں۔

NAB حکومت میں شفاف کارکردگی (transparency) چاہتا تھا، تاکہ حکومت کے سب کام شفاف نظر آئیں۔ بذات خود NAB کے کاموں میں اتنی ٹرانسپیرینسی نہیں تھی۔ میں نے یہ لازم سمجھا کہ ہمارے دفتروں میں بھی ہر کام شفاف ہو، تاکہ NAB کے ادارے کے اندر کرپشن کی گنجائش کم سے کم رہ جائے، اور عوام اس ادارے پر بھروسہ کر سکیں۔ پہلا فیصلہ تو یہ کیا کہ اپنے دفتر میں فائلوں پر فیصلے دینے بند کر دیئے۔ ایک ہفتہ وار کانفرنس منعقد کرنی شروع کی، جس کا نام ایگزیکٹو بورڈ (Executive Board) رکھا۔ اس میں کیسوں سے منسلک تمام عہدیداران شامل ہوتے۔ عموماً ان کانفرنسوں میں بیس سے زیادہ لوگ ہوتے۔ تفتیشی ٹیمیں، پراسیکیوٹر (Prosecutor)، ان سے اوپر کے ہر سطح کے عہدیدار، قانونی ماہرین، ڈپٹی چیئرمین اور پراسیکیوٹر جنرل اکاؤنٹیبلٹی (PGA, Prosecutor General Accountability) سب ہی اس کی میٹنگ میں بیٹھتے۔ اس بورڈ کے سامنے کیس پیش کیا جاتا، تمام اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے اور مشاورت کے بعد یہیں پر میں فیصلہ سناتا اور اس پر دستخط کرتا۔ چاہے کوئی کیس کھولنا ہو، بند کرنا ہو، اسے کورٹ میں لے جانا ہو یا اس سے منسلک کوئی معاملہ ہو، یہیں اس پر فیصلہ کیا جاتا۔ یہ سارا سلسلہ ویڈیو ریکارڈ ہوتا، تاکہ آئندہ کے لئے ریکارڈ رہے۔ NAB کے ہر صوبائی دفتر میں بھی اسی طرح کا سلسلہ جاری ہوا۔ ایک طاقتور ادارے کی طاقت کو لگام نہ ڈالی جائے، تو وہ عوام کے لئے خاصی پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔

نیب میں بینکوں کا رسوخ ختم کرنے میں شوکت عزیز کا ٹھٹھا

بینک افسران نے مالیاتی معاملات سنبھال رکھے تھے جس سے بینکوں کو تحفظ ملا۔ وزارت صحت کے محکموں کی تطہیر کرنے پر ہلچل مچ گئی۔ لیکن یہ کام بھی نیب سے ہٹائے جانے کے سبب مکمل نہ ہو سکا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

نیب سربراہ بننے کے بعد نیب کے دفاتر میں لوگوں کا آنا جانا بند کیا۔ تفتیش کیلئے علیحدہ کمروں کا استعمال شروع کیا۔ NAB کے کم از کم تین عہدیداران تفتیش کیلئے موجود ہوتے۔ ان کمروں میں ویڈیو کیمرے نصب کئے گئے اور تفتیش کا باقاعدہ ویڈیو ریکارڈ رکھا جاتا۔ تمام دفاتر کو کمپیوٹر کے نظام سے آراستہ کیا۔ تفتیش روز کمپیوٹر پر چڑھانی ہوتی اور پھر تبدیل نہ کی جاسکتی۔ اس طرح سے ہر کام کی پیش رفت پر روز بروز نظر بھی رکھی جاسکتی۔ نیب کے کسی افسر کی کرپشن کو بے نقاب کرنے والے کیلئے دس لاکھ روپے کا انعام بھی رکھا۔ ان ملاقاتیوں کیلئے جو کسی کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آتے، ایک علیحدہ کمرہ بنوایا۔ اس کمرے کی ہر میٹنگ کی بھی ویڈیو ریکارڈ ہوتی۔ کچھ لوگوں کو یوں بھی پریشانی تھی کہ انہیں نیب میں بلوایا جاتا اور گھنٹوں بٹھائے رکھتے، کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ اس کا بھی باضابطہ طریقہ بنا دیا۔ NAB کی حراست (arrest) میں لینے کی طاقت کو سختی سے محدود کر دیا، کہ کہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لوگوں کو حراست میں لے کر بدنام نہ کیا جائے۔ جن لوگوں کی تفتیش ہو رہی ہو اور ان کی جائیداد منجمد کی گئی ہو، انہیں ان کے جائز گھریلو اخراجات کیلئے رقم نکلوانے کی اجازت دی، تاکہ گھروا لے فاقوں پر نہ آجائیں۔ جب کورٹ فیصلہ سنا دے، پھر چاہے اس کی ساری جائیداد ضبط ہو جائے۔ کوشش کی کہ ملازموں کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ نہ ہو۔ یہ بھی لازم کیا کہ کسی ملازم کا نام اس وقت تک باہر نہ نکلے، جب تک اس کا کیس کورٹ میں نہ پہنچ جائے۔ پھر چاہے کورٹ سے یہ نام نکلے، NAB سے نہ نکلے۔ اسی قسم کی اور کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں کی گئیں، جن سے NAB کی کارکردگی بہتر ہو سکے اور قوم کا اس اہم ادارے پر اعتماد قائم ہو سکے۔



یہ خاموشی کہاں تک؟
ایک سچا کہہ سکتا ہوں

ایف جی جی جنرل (ریٹائرڈ) شاہد عزیز

یہ درست ہے کہ میرے آنے سے پہلے NAB میں انتخابی (selective) کام بھی ہوتا تھا۔ مگر یوں نہیں تھا کہ کسی پر خواہ مخواہ کا الزام لگا یا جاتا۔ سیاسی مفاد کی خاطر کیس کھولے یا بند ضرور کئے جاتے رہے تھے، مگر ان میں کچھ ہوتا ضرور تھا۔ اگر کہیں غلط کیس بنا ہوگا، تو ہو سکتا ہے غلطی ہوئی ہو، یا یوں کہیں کہ پورے شواہد نہ مل سکے ہوں گے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کبھی بدعتی سے غلط کیس بنایا ہوگا۔ الیکشن میں NAB کا استعمال رہا ہوگا، کہہ نہیں سکتا۔ ایک مرتبہ کہیں چند سیٹوں پر انتخاب ہوئے۔ مجھ پر کافی زور ڈالا گیا، کسی کا کیس بند کرنے کیلئے اور کسی کا دوبارہ کھولنے کیلئے۔ لیکن میں نے سختی سے اس کھیل میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

NAB میں مالیاتی معاملات کو دیکھنے کیلئے بینکوں کے ملازمین کام کرتے تھے۔ یہ افسران اپنے بینکوں سے تنخواہ اور دیگر مراعات پاتے اور NAB میں اپنا عرصہ پورا کرنے کے بعد واپس بینکوں میں چلے جاتے۔ اس طریقے سے بینکوں کا اثر و رسوخ NAB پر قائم تھا اور بینکوں کو خاصا تحفظ حاصل تھا۔ میں اس ناجائز سلسلے کو ختم کرنے پر لگا تھا، لیکن پورا نہ کر پایا اور NAB سے نکلنا پڑا۔ اس کو ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے وزیراعظم شوکت عزیز صاحب تھے جو بینکوں کو اوٹ فراہم کرنے میں پیش پیش رہتے۔ وہ NAB کو اتنے پیسے دینے پر آمادہ نہیں تھے کہ ہم ایسے تجربے کار لوگوں کو رکھ سکیں اور بینکوں کے ملازمین کو واپس کر سکیں۔ نہ جانے یہ سلسلہ ختم ہوا یا نہیں۔

کچھ معائنہ ٹیمیں بھی تشکیل دیں، جو اچانک موقع پر پہنچ کر کسی کام کو دیکھ سکیں۔ مثلاً کوئی سڑک یا عمارت سرکار نے بنائی ہو، تو اس سلسلے کے ماہرین کو ساتھ لے کر موقع پر اس کام کی جانچ پڑتال کی جاسکے۔ یا عام شہریوں کی اجتماعی تکلیف کو دور کر سکیں۔ مثلاً ادویات کی فیکٹری کا معائنہ، کھانے پینے کی اشیا تیار کرنے کی فیکٹریوں یا فروخت کرنے کی جگہوں کا معائنہ، جانوروں کی قربانی گاہوں (abattoirs) کی جانچ پڑتال، دیکھنا کہ پٹرول پمپوں پر صحیح قسم کا پٹرول بکتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ان کارروائیوں سے ظاہر ہے تمام کا تمام تو ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا، مگر مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں کچھ نہ کچھ پکڑ کا خوف (deterrence) قائم ہو سکے۔

حکومت کے اداروں میں کوئی معاملہ کھلا اور شفاف نہیں ہوتا۔ ہر چیز چھپی ہوئی رکھی جاتی ہے، جیسے کوئی قومی سلامتی کے اہم راز ہوں۔ اسی سے تمام بیماریاں جڑ پکڑتی ہیں۔ اس سلسلے میں NAB کے پریونشن (prevention) ونگ کو مضبوط کیا گیا، اور پہلے ہدف کے طور پر صحت کے محکمے کو چنا گیا۔ ہمارے قوانین میں لکھا تھا کہ NAB حکومتی اداروں کے کام کا جائزہ لے گی اور ایسے طریقے تجویز کرے گی جن کو اپنانے سے ان محکموں کی کارکردگی کو شفاف بنایا جاسکے۔ البتہ قوانین میں ان تجاویز پر عمل کرنا لازم قرار نہیں دیا گیا تھا۔ اس کا فیصلہ وزارتوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وزارت صحت کے تمام دفاتر اور محکموں کا جائزہ لیتا ہوں، پھر دیکھوں گا کہ اپنے کام کو شفاف بنانے کیلئے انہیں کیسے آمادہ کیا جائے۔ ہر محکمے میں اتنے ناجائز کام ہو رہے تھے کہ پکڑے جانے کے خوف کی وجہ سے NAB کو آسانی سے ٹالائیں جاسکتا تھا۔ جب یہ کام شروع کیا تو وزارت صحت میں خاصی ہل چل مچی، لیکن وہ ہمارے کام کو روک نہ سکے۔ مگر یہ بھی، بہت سے اور کاموں کی طرح، NAB سے جلد نکلنے کی وجہ سے آدھے راستے ہی میں رہ گیا۔ ان میں سے چند ابتدائی ترجیحات کا اعلان NAB کی ویب سائٹ (website) پر جنوری کے مہینے میں کیا گیا۔ کچھ ہی دن بعد ایک اخبار میں خبر چھپی۔ لکھا تھا کہ فیڈرل سیکریٹریوں کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں خدشات کا اظہار کیا گیا کہ اگر سرکاری ملازمین کو NAB سے پناہ نہ دی گئی، تو حکومت کا کام نہیں چل سکے گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ NAB کا ادارہ عزت دار لوگوں کو ذلیل کرتا ہے اور سرکار کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

کوئی بھی سرکاری ملازم ایسے ماحول میں فیصلہ لینے سے ڈرتا ہے۔ پھر کیبنٹ سیکریٹری صاحب نے ایک کمیٹی تشکیل دی، کہ اس مسئلے کا حل تلاش کرے۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو خاصا حیران ہوا۔ مجھے ابھی آئے ہوئے شاید دو ماہ ہی گزرے ہوں گے، اس سے پہلے بھی تو NAB کئی برسوں سے چل رہا تھا، آخر میں نے ایسا کیا، کیا کہ اتنی پریشانیاں پیدا کر دیں؟ شاید یہ اعلان کہ NAB کا فوکس حکومتی مشینری پر ہوگا اور ان سے پیسے واپس لے کر کیس بند کرنے کا سلسلہ بھی نہیں کیا جائے گا، پریشانی کا باعث رہا ہو۔ یا شاید میری شہرت (reputation)، کہ سنتا نہیں، بھی باعث تشویش رہی ہو، کہہ نہیں سکتا۔ پھر میں نے کیبنٹ سیکریٹری صاحب کو خط لکھا کہ اگر NAB سے کچھ پریشانیاں تھیں تو مجھ سے کوئی رابطہ کر لیتے اور اس مسئلے کا ہم مل کر کوئی حل نکال لیتے۔ یوں مجھ پر میڈیا کے ہاتھوں دباؤ ڈالنے کی کیا وجہ ہے؟ پھر میں ان سے ملنے گیا۔ نہایت ہی اچھے انسان تھے، جن سے مل کر قدر کرنے کا دل چاہے۔ انہوں نے کہا ضرور اس کا مل کر کوئی حل نکال لیں گے، لیکن اس کے بعد کوئی حل نکالنے کی کوشش نہیں ہوئی۔ (جاری ہے)



کرپشن کے خلاف لڑنے میں کسی نے ساتھ نہ دیا

نیب میں چند ماہ بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ حکومتی شخصیات میرے خلاف صف آرا ہو گئی ہیں۔ میڈیا کو اعتماد میں لینے کی کوشش رایگان گئی۔ تیل کی انکوائری پر شوکت عزیز سب سے زیادہ ناراض تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس نیب میں آنے کے چند مہینے کے اندر ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ حکومت کا سارا نظام اور ملک کے بڑے بڑے اشخاص، تمام ہی میرے خلاف صف آرا ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ میڈیا کو ساتھ لیتا ہوں، کچھ اپنے لیے حمایت اکٹھی کروں، یوں اکیلے کیسے اور کس کس سے لڑوں گا۔ میڈیا کے چند اہم نمائندوں کو 4 مئی 2006ء کو چائے پر بلایا، کچھ نے معذرت کر لی۔ تفصیل سے NAB کے بارے میں بریفنگ (briefing) دی، جو رد و بدل کی تھیں وہ بتائیں، اپنی ترجیحات بیان کیں۔ میں نے اُن سے کہا ”مجھے احساس ہے کہ آپ پر مجھ سے زیادہ بوجھ ہے۔ میرا ایک ٹکائی ایجنڈا ہے اور مجھ سے سنبھلنا نہیں، آپ نے اس قوم کا ضمیر ہونے کا بیڑا اٹھایا ہے اور یقیناً آج کل کے حالات میں، آپ کی زندگی پر اس کا خاصا بوجھ ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ NAB کی selectivity آپ کے ضمیر کو چھتی ہے۔“ پھر میں نے کہا ”میں آج آپ کے ساتھ اپنے خوف اور اپنی امیدیں اس توقع سے بانٹ رہا ہوں کہ خوف سے نکل کر امید تک آنے میں مجھے آپ مدد حاصل رہے۔ آپ کو ایک دوسرے کا ساتھ ہے، لیکن میں خود کو یہاں بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں۔“

میں نے اُن سے کہا ”کرپشن اس طرح ہمارے معاشرے میں رچ بس گئی ہے کہ اس کو نہ ہی سیاست سے جدا کیا جاسکتا ہے، نہ گورنمنس سے، نہ عدلیہ سے اور نہ ہی تجارت، اسپتالوں، اسکولوں یا انفرادی باہمی تعلقات سے اور نہ ہی ہماری مسجدوں سے۔ شاید اب یہ ہماری زندگیوں میں اس طرح سرایت کر چکی ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو۔ مگر میں نے آپ کو یہاں یہ رونا روٹنے کے لیے نہیں بلایا۔ میں نے آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس کرپشن سے ڈسے ہوئے مظلوموں کی جینیں مجھ سے زیادہ صاف سنائی دیتی ہیں۔“ پھر میں نے کہا ”میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں اس ذمہ داری کو نہیں نبھاسکتا جو مجھے سونپی گئی ہے، کرپشن نہیں مٹا سکتا۔ یہ میری صلاحیت سے باہر ہے۔ پھر بھی چونکہ میں ایک سپاہی ہوں، گوریٹا ہو چکا ہوں، جیسے بھی ہو سکا آخری حد تک کرپشن کے خلاف لڑوں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کر لوں گا کہ کس حقارت سے آج آپ قوم کے ایک سپاہی کو دیکھتے ہیں۔“

پھر انہیں NAB کی ساری تفصیلات دینے کے بعد میں نے آخر میں کہا ”میری کوشش رہے گی کہ NAB کو ایسے مقام پر پہنچاؤں کہ یہ ادارہ عزت کے لائق ہو۔ شاید مجھ پر ”آئیڈیالٹ“ کا ٹھپہ لگایا جائے، مگر میں نے یہی دیکھا ہے کہ اصلیت ہمیشہ آئیڈیل سے نیچے ہی رہتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے آئیڈیل کا چراغ بجھا دیں۔“ میں نے NAB کے مستقبل کے بارے میں کہا ”NAB کو سیاست سے چھٹکارا پاتے ہوئے ایک عرصہ لگے گا اور ہمیں ہوش سے چلنا پڑے گا، ورنہ اینٹی کرپشن کا محل زمین بوس ہو جائے گا۔ ہمارے فیڈرل سیکریٹری اس وقت بھی NAB کے قوانین میں رد و بدل کی کوشش میں لگے ہیں۔“ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ”ایک مجرم کی گردن کی اتنی قیمت نہیں کہ جب الیکشن سر پر ہوں تو حکومت کو غیر مستحکم کر دیا جائے اور نہ ہی اتنی قیمت ہے کہ NAB کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا جائے۔“ میں نے کہا ”میری پوری کوشش ہوگی کہ NAB کو الیکشن کے کھیل سے باہر رکھوں۔ ابھی سے کچھ سیاسی حلقوں سے ایک دوسرے کے خلاف شکایات آنی شروع ہو گئی ہیں۔ آج اینٹی کرپشن کسی پارٹی کا ایجنڈا نہیں۔ سول سروس بھی چھوٹ چاہتے ہیں اور آدھی درجن مقدس گائیوں کی فائلیں میرے دراز میں پڑی ہیں۔ چینی کی انکوائری بند کروائی جا چکی ہے۔ تیل کی انکوائری پر دباؤ پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ ہر طرف یہی چیخ و پکار ہے کہ معیشت ڈوب جائے گی اور یہ کہ کرپشن اور ترقی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے۔ میری کوشش ہے کہ کوئی توازن قائم رکھ سکوں، مگر میں جانتا نہیں کہ یہ توازن کہاں ٹھہراؤں۔ میری رہنمائی کریں۔ NAB کی بدخواہی نہ کریں، ملک کو اس ادارے کی ضرورت ہے۔ NAB کی مدد کریں۔“ یہ ملاقات بھی اسی کمرے میں ہوئی جہاں ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ ہوتی تھی اور یہ بھی ویڈیو ریکارڈ ہو گئی۔ میں نے بھی ایک کاپی رکھ لی۔ میں نے دل سے یہ باتیں کہیں، بہت خلوص سے انہیں پکارا، لیکن چونکہ میں سابقہ فوجی تھا، شاید اُن کے دلوں میں میرے خلاف یہی تاثر قائم رہا کہ میں حکومت کا ہی کارندہ ہوں، یوں ہی انہیں متاثر کرنے کو بلایا ہے۔ کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ مجھ پر کچھ اُچھالا جاتا رہا اور میں اپنی سی کوشش میں لگا رہا۔ لڑتا رہا۔ ایک سابق گورنر صاحب نے تو یوں بھی کہہ دیا کہ یہ آستین کا سانپ ہے، حالانکہ جانتے تھے کہ میں اُن کی طرح کسی کی آستین میں نہیں پلتا۔ پھر 9 دسمبر 2006ء کو جب اینٹی کرپشن ڈے منایا گیا، ہم United Against Corruption کی آواز کے ساتھ کانسٹیبلشن یونیورسٹی پر مارچ بھی کی۔ ایڈمی صاحب آئے اور میاں سومرو صاحب اور چند در در کھنے والے، جن میں گلوکار شہزاد رائے اور رضا ہراج MNA صاحب بھی شامل تھے۔ اُس ہی دن کی تقریب میں صدر صاحب کو آنا تھا، نہیں آئے۔ وزیراعظم صاحب آئے اور NAB کو بہت برا بھلا۔ کہا یہ ادارہ نااہل ہے، کرپٹ ہے اور حکومت کے باعزت ملازمین کو ذلیل کرتا ہے۔ کرسیاں بھرنے کے لیے اسکولوں کے طلبا کو بلالیا تھا اور کسی کو تو ہم پر اعتقاد تھا نہیں۔ صرف سیاسی نعرے کے طور پر NAB کی بات کرتے، جنہیں دوست کہتے ہیں وہ بھی اور جنہیں دشمن کہیں وہ بھی۔ شوکت عزیز صاحب جب چلے گئے تو چائے کے وقفے کے دوران، کچھ اخبار والوں نے پوچھا کہ آخر کیا معاملہ ہے، وزیراعظم آپ سے کیوں اتنے ناراض ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ کو اُن سے پوچھنا چاہئے تھا۔ تو کسی نے کہا کہ ہم جانتے ہیں، یہ ناراضگی اس لیے کہ آپ تیل کے سلسلے کی انکوائری بند نہیں کر رہے۔ جانتے تو سب ہی تھے، لیکن کوئی ہاتھ تھامنے کو تیار نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح اکیلے ہی لڑتا رہا۔ (جاری ہے)

مُشرف نے پینی قیمتوں میں اضافے کی تحقیقات رکوا دی تھیں

ایگزیکٹو آرڈر میں کہا گیا، انکوائری نہ روکی گئی تو چینی غائب اور قیمتوں میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ سیاسی وڈیروں سے ڈرنے والے پھر بھی یہ سمجھتے رہے کہ ہر چیز پر ان کی گرفت ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن ایون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک؟“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

”صدر صاحب نے چینی کی انکوائری بند کروادی ہے۔“ جنرل حامد جاوید صاحب کا فون تھا، جو صدر صاحب کے ساتھ چیف آف اسٹاف (COS) تھے۔ میں نے کچھ جھٹ کی کہ ابھی تو شروع ہی کی ہے اور یہ کہ بند کرنے کے بہت برے اثرات ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔ تو کہا ”یہ ان کا ایگزیکٹو آرڈر (executive order) ہے۔ اب یہ انکوائری نہیں ہوگی۔“ میں نے صدر صاحب سے فون پر بات کرنے کی بہت کوشش کی، مگر آنے والے کئی دنوں تک نہ ہی میں ان سے مل سکا اور نہ ہی میرا رابطہ فون پر ہو سکا۔ وہ بہت ”مصرف“ تھے۔ پھر میں نے اخبار میں اعلان کیا کہ ”چینی کی انکوائری بند کر دی گئی ہے، کیونکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ اس انکوائری کی وجہ سے چینی کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے، حالانکہ NAB اس موقف سے اتفاق نہیں کرتا۔“ اس خبر کے اخبار میں آنے پر جنرل حامد نے فون پر خفگی کا اظہار کیا کہ انکوائری بند کرنے کی خبر اخبار میں کیوں دی گئی؟ میں نے کہا ”اس لیے کہ عوام اس امید پر نہ بیٹھے رہیں کہ NAB ان کے مفاد کا بدستور تحفظ کر رہا ہے۔ جب شروع کرنے کی اطلاع دی، تو بند کرنے کا بتانا بھی لازم ہے۔ کیا انہیں دھوکے میں رکھا جائے؟“ پھر یہ سوال اٹھایا کہ یہ کیوں لکھا کہ ”NAB اس موقف سے اتفاق نہیں کرتا؟“ میں نے کہا ”اختلاف کرتا ہے، اسی لیے کہا ہے اور یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انکوائری کیوں بند ہوئی۔“ کچھ بد مزگی کے بعد بات ختم ہو گئی۔

نیب میں میرے آنے کے کچھ عرصے بعد بازار میں چینی کی قیمت میں یکا یک اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اخباروں میں بھی اس کے بارے میں کافی تفصیلات چھپیں۔ میں نے NAB کے ذریعے کچھ بنیادی باتیں معلوم کیں، تو قیمت بڑھنے کی کوئی معقول وجوہات سامنے نہ آئیں۔ ایک چھوٹی سی ابتدائی تفتیش (preliminary inquiry) کی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ صرف چینی کی ملوں کے مالکان کی مرضی سے قیمت بڑھائی گئی ہے۔ اس کی وجوہات ہماری مارکیٹ کے حالات پر مبنی نہیں تھیں۔ میں نے اس کی باقاعدہ انکوائری کے احکامات جاری کر دیے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ چینی کے کاروبار کی پیچیدگیاں شاید ہماری سمجھ میں نہ آسکیں، میں نے ریٹائرڈ بریگیڈیئر اکرم علی خان صاحب سے درخواست کی کہ اس سلسلے میں اپنے تجربے سے ہمیں مستفید فرمائیں۔ یہ فوجی فاؤنڈیشن میں کئی سال چینی کے کاروبار سے منسلک رہ چکے تھے۔ ان کا تعلق میری ہی یونٹ سے تھا اور مجھے ان پر پورا اعتماد تھا۔ انکوائری شروع ہوتے ہی کچھ سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ پہلے ان کا ایک وفد وزیراعظم صاحب کے پاس آیا، پھر صدر صاحب کو بھی ملنے گیا۔ ان سب کے نام اور تفصیلات اخباروں میں آتی رہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل حامد جاوید نے مجھ سے کہا کہ میں یہ انکوائری بند کر دوں، ورنہ مارکیٹ سے چینی اٹھالی جائے گی۔ پھر مجھے چیئرمین CBR عبداللہ یوسف صاحب ملے، اور سمجھایا کہ تم مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ (marked dynamics) کو نہیں سمجھتے ہو، ذرا آرام سے چلو۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ میں نے لوگوں کی مشکلات کا ذکر کیا، تو کہنے لگے ”اگر تم نے انکوائری بند نہ کی تو چینی کی قیمت دگنی ہو جائے گی۔ تم کیا کر لو گے؟ پھر لوگوں کا کیا ہوگا؟“ میں وزیراعظم صاحب سے بھی ملا۔ میں نے کہا صرف چار چھ بڑے حضرات ہیں، جن کے زور پر چینی کی قیمت یوں بڑھائی گئی ہے۔ یہ تو حکومت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اگر حکومت اور NAB مل کر بھی انہیں قابو میں نہ رکھ سکیں تو پھر گورنمنس کیا رہ جائے گی؟“ کہنے لگے ”یہ گورنمنس کا مسئلہ نہیں ہے، اس میں صرف سیاسی پیچیدگیاں ہیں۔“ انہوں نے کہا ”مجھے کوئی اعتراض نہیں، اگر آپ یہ انکوائری جاری رکھیں۔“

میں نے سوچا کہ کچھ عرصے کا ہی وقت چاہئے کہ چینی کی قیمت سنبھلی رہے، پھر انکوائری کے بعد حالات قابو میں آجائیں گے۔ دفتر آ کر چینی برآمد کرنے والے بڑے تاجروں کو کھلوا یا کہ وہ اسلام آباد آ کر مجھے ملیں۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں، ہم نہ ہی مارکیٹ سے چینی غائب ہونے دیں گے اور نہ ہی اس کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میری ان تاجران سے ملاقات ہوتی، چینی کی انکوائری بند کروا دی گئی۔

اس انکوائری کے بند ہونے سے NAB کی ساکھ پر بہت برا اثر پڑا۔ اخبار میں ہمارے اعلان کے باوجود کوئی اخبار والا پوچھنے نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ صرف کچھ دن کچھ اچھا لگا جاتا رہا۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ سارا ہی ڈرامہ چل رہا ہے، چیئرمین NAB بھی فوجی ہے، اسی ڈرامے کا کردار ہوگا۔ وہ دن ہی ایسے تھے۔ تمام میڈیا مشرف صاحب کے خلاف ہو چکا تھا۔ چینی کی ملوں کے مالکان، سیاسی وڈیروں، عوام کے اصل غمگسار، جھوٹ سے بھرے دل لیے، کلف لگائے لباس پر چمکتے چہرے سجائے، سیاہ بوٹ پہنے والے کی گردن پر پاؤں رکھے کھڑے تھے۔ اس ہی کے ساتھیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ اور وہ، سر جھکائے یہی سمجھتے رہے کہ ہر چیز میری گرفت میں ہے۔ سمجھا کہ جب میرے ارد گرد طواف کرنے والے خوش ہیں، تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔ اس خود فریبی میں سکون تھا۔ اس میں تصادم نہیں تھا، جس سے وہ گھبراتے تھے۔ جس سے اس کا حوصلہ ٹوٹتا تھا۔ اس محدود اور محفوظ گوشے میں بہادری کو کوئی لکارنا نہیں تھا۔ خوف چھپا رہتا۔ اس میں تحفظ کا سراپ تھا۔ اس ہی راہ پر چلتے چلتے وہ تنگ گلی میں پھنستے چلے گئے۔

(جاری ہے)

وزارت پٹرولیم میں 81 ارب روپے کے کھلے تھے

نیب کی ابتدائی رپورٹ مشرف کو دی تو انہوں نے اسے چھینک دیا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں کہا، پھر کوئی اور چیئر مین نیب ڈھونڈ لیں۔ میں آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس صدر صاحب نے میز پر رکھے کاغذات کو ہاتھ کے جھٹکے سے دھکیلا، وہ پھسلے ہوئے میز کے آخری سرے پر جا کر ٹھہر گئے۔ "I don't care" what you have written in it. I don't even want to read it" (مجھے پروا نہیں کہ تم نے اس میں کیا لکھا ہے۔ میں اسے پڑھنا بھی نہیں چاہتا)۔ انہوں نے غصے سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ یہ اکتوبر 2006ء کی بات ہے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ میز کے سامنے میں



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ

اور جنرل حامد جاوید۔ تیل کی انکوائری کی رپورٹ تھی، جسے انہوں نے یوں پھینکا تھا۔ ذہن سے خیال گزرا کہ اس ملک کے محکمہ احتساب کا سربراہ ہوں، اور آپ میری بات بھی سننا گوارا نہیں کرتے! میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری آواز بھی بلند ہو گئی "پھر کوئی اور چیئر مین NAB ڈھونڈ لیں، میں آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتا"۔ جنرل مشرف بھی کھڑے ہو گئے، جنرل حامد بھی کچھ دیر سناٹا رہا۔ وہ مجھے سٹپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں کمرے سے باہر جانے لگا، تو جنرل حامد کی آواز آئی۔ "سراہم اس انکوائری کو دیکھتے ہیں۔ کوئی حل نکال لیں گے"۔ وہ بھی میرے پیچھے باہر آ گئے۔

حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجویزاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

میں جنرل مشرف کو اس انکوائری کے بارے میں شروع میں ہی بتا چکا تھا۔ NAB میں آنے کے بعد ان سے میری پہلی ملاقات یکم اپریل 2006ء کو ہوئی، جب انہیں 2005ء کی سالانہ رپورٹ دینے گیا۔ میں نے انہیں کرپشن کی روک تھام کے بارے میں اپنے تاثرات اور کام کی کچھ تفصیلات بتائیں۔ جو ٹریمیم NAB کی تنظیم اور کارروائیوں میں کی تھیں، وہ بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ نواز شریف صاحب کے خلاف کیمرز پر اب تک کوئی

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب "یہ خاموشی کہاں تک" سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

انکوائری نہیں ہوئی ہے، کئی ڈبوں میں کاغذات بند پڑے ہیں۔ وہ چونکہ ملک میں حاضر نہیں ہیں، انکوائری مکمل تو نہیں کی جاسکتی، مگر اتنا کام تو ہو سکتا ہے کہ الزامات کا کوئی جواز بنے۔

میں نے کہا کہ اگر وہ کسی وقت ملک میں واپس آتے ہیں، تو بغیر کسی جواز کے NAB ان کو گرفتار نہیں کر سکے گا۔ میں نے یہ اس لیے کہا کہ کہیں اگر ایسا موقع آئے، تو وہ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ ان کاغذات کو بند ہی پڑے رہنے دیں۔ کیونکہ اس سلسلے سے سیاسی توازن منسلک تھا، میں نے یونہی کیا۔ بے نظیر بھٹو اور زرداری صاحب کے خلاف کیمرز کا احوال بتایا۔ پھر میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں چینی اور تیل کے سلسلے میں انکوائری کر رہا ہوں، تھوڑی بہت تفصیلات بھی بتائیں۔ وہ یہ سن کر کچھ غیر مطمئن سے ہوئے اور کہا کہ ان میں کچھ نہیں نکلے گا، خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرو گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں انکوائری کر کے آپ کو بھجوا دوں گا، آپ خود فیصلہ کر لیجئے گا کہ کیا کرنا ہے۔ اس پر انہوں نے بات کو جانے دیا۔ جو دباؤ ان پر

پڑنے والا تھا، وہ اس سے ابھی واقف نہیں تھے، اور نہ ہی میں۔

اخبارات میں خاصی تفصیلات چھپ چکی تھیں کہ وزارت پٹرولیم میں بڑے پیمانے پر گھپلے ہو رہے ہیں۔ شاید وزارت کے کچھ دل چلے افسران نے اخبار والوں کو اس خورد برد کی تفصیلات فراہم کی تھیں۔ جب میں نے ابتدائی تفتیش کروائی، تو ان تمام الزامات میں حقیقت دکھائی دی۔ پھر 30 مارچ 2006ء کو، 2001ء سے تیل کی قیمتوں کے تعین کے طریقہ کار اور اس پر عمل درآمد کی باقاعدہ انکوائری کے احکامات جاری کئے۔ کیبنٹ کے ایک فیصلے کے تحت یکم جولائی 2001ء سے تیل کی قیمتوں کا تعین OGRA (Oil and Gas Regulatory Authority) کو سونپ دیا گیا تھا، لیکن حقیقتاً یہ کام نجی آئل کمپنیوں کی ایڈوائزری کمیٹی (OCAC) ہی کرتی رہی۔ اس انکوائری کا تعلق کسی ملکی یا غیر ملکی تیل کی کمپنی یا پاکستان میں موجود کسی ریفاہی کی کارکردگی سے نہیں تھا۔ صرف یہ دیکھنا تھا کہ عوام جو پیٹرول پمپوں پر تیل کی قیمت ادا کرتی ہے، اس کا تعین حکومت کس طرح سے کر رہی ہے۔ اس کے لیے بھی ایک ایکسپٹ، عباس رضا صاحب کی امداد حاصل کی، تاکہ اس پیچیدہ مسئلے کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے بھی اس پر کچھ دسترس پالی۔ پھر وزارت پٹرولیم اور وزارت خزانہ کے افسران کو بلوایا، تمام متعلقہ کاغذات حاصل کئے اور ان کے عکسے نظر کو سنا گیا۔ وزیراعظم صاحب کے مشیر برائے توانائی (Advisor to PM on Energy) مختار احمد انکوائری شروع ہونے کے دو ہفتے بعد ہی NAB میں آ گئے اور تفصیلات جانی چاہیں۔ انہیں تمام تفصیلات، جو اس وقت تک NAB کے علم میں تھیں، بتائی گئیں۔ وہ انکوائری کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی بدعنوانی نہیں ہوئی اور اس انکوائری سے صرف حکومت کے کام میں مداخلت ہوگی۔ پھر سیکریٹری پیٹرولیم، احمد قار مجھ سے ملنے آئے اور انہیں بھی تمام تفصیلات بتائیں۔ انکوائری کے دوران لگاتار مجھ پر اسے ختم کرنے کے لیے دباؤ پڑتا رہا۔ زیادہ متحرک جنرل حامد اور چیئر مین CBR عبداللہ یوسف تھے۔ جب عبداللہ یوسف کے بیان کا وقت آیا، تو میں نے کہا کہ یہ بہت سینئر افسر ہیں، ان سے پوچھ لیں کہ کیا ہم انہیں ایک سوال نامہ بھیج دیں، جس کے جواب وہ لکھ کر ہمیں بھیجیں، یا کسی افسر کو ان کے پاس بیان لینے کے لیے بھیج دیں، مگر انہوں نے کہا کہ میں خود NAB میں آؤں گا۔ ان کے آنے پر، NAB کے ڈپٹی چیئر مین۔ مہر جنرل محمد صدیق نے ان کا کارپورچ میں استقبال کیا، پھر اپنے دفتر لے گئے، وہیں ان سے چند سوالات پوچھے گئے، چائے پلائی، پھر جنرل صاحب انہیں کار تک چھوڑنے آئے۔ مگر اس بات کا اس قدر جھوٹا پردہ پیگنڈا کیا گیا کہ اتنے باعزت انسان کو NAB نے بلا کر ذلیل کیا۔ وزیراعظم صاحب نے اس کی جھوٹی کہانیاں بنائیں اور جنرل مشرف بھی سن کر خفا ہوئے اور فون پر مجھ سے اس کا اظہار بھی کیا۔

مجھے ایک دن دفتر بلا لیا۔ خاصے ناراض تھے۔ کہنے لگے۔ "یہ تم کیا تیل کی انکوائری میں لگے ہوئے ہو؟ اس میں کچھ گھپلا نہیں ہے۔ پہلے تم نے چینی کی انکوائری شروع کر دی، اس میں بھی کچھ نہیں تھا۔ میں نے خود تمام تفصیلات معلوم کی ہیں، خود دیکھا ہے، DHA کی بھی انکوائری کر دی تھی، اس میں بھی کچھ نہیں تھا"۔ میں چپ رہا تو کہا "تم بہت ہٹ دھرم (rigid) ہو، تم سمجھتے ہو کہ تم ہی ٹھیک ہو، باقی ساری دنیا غلط ہے"۔ اتنا سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ چینی کی انکوائری شروع ہوتے ہی بند کر دادی تھی۔ خود کیا دیکھا تھا؟ وہی ناجوٹوں کے ماکان نے بتایا؟ میں نے کہا "سراڈرا ٹھہر جائیں۔ اس مباحثے کو یاد کریں، جس میں آپ نے کہا تھا کہ 90 فیصد تمہاری بات مان لیتے ہیں کہ تم ٹھیک ہو، لیکن 10 فیصد یہ بھی تو گنجائش دو کہ ہم ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ خود اپنے منہ سے آپ نے یہ بات کہی تھی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ منصوبہ پھر بھی اس 10 فیصد تخمینے پر ہی بنایا گیا، 90 فیصد پر نہیں۔ اس دن بھی آپ نے مجھ پر یہی الزام لگایا تھا، تو کون ریجڈ (rigid) تھا؟ اور آج بھی مجھ پر یہی الزام ہے"۔ کھسکا نا سامنے بنا لیا اور کہا "کون سا مباحثہ؟ مجھے تو یاد نہیں"۔ سارے کورمکانڈر کی موجودگی میں گھنٹوں کی بحث اور اس کا وہ انجام، کون بھول سکتا ہے؟ پھر میں نے دوسری بات یاد دلائی "اور جہاں تک DHA کا سوال ہے، آپ نے خود کہا تھا کہ بڑے پیمانے پر کرپشن ہوئی ہے، انہیں سزا ملنی چاہئے، لیکن کچھ اور وجوہات کی بنا پر اپنا فیصلہ مؤخر کر دیا تھا۔ آپ کو یاد ہے نا؟" موڈ بدل گیا، آواز دھیمی ہو گئی، کہنے لگے "دیکھو نا، تم نے بات ہی اتنی بڑھا دی تھی۔ خاموشی سے مجھے بتا دیتے، ہم ان لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیتے۔ DHA کا مسئلہ ختم ہو جاتا"۔ یعنی معاملے کو جھاڑ کر قالین کے نیچے کر دیتے۔ خیر، پرانی باتیں تھیں، اب انہیں مزید چیئر کر کیا کرتا۔ یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ میں انکوائری مکمل کر کے آپ کو بھجوا دوں گا۔ جو آپ مناسب سمجھیں کر لیجئے گا۔

جنرل حامد صاحب کے دفتر سے لگاتار دباؤ پڑتا رہا کہ جتنی بھی انکوائری کی ہے، ختم کر کے بھجوائیں۔ جون کے شروع میں، ان کو انکوائری کی ابتدائی رپورٹ کی تفصیلات ان کے دفتر جا کر بتائیں۔ سن کر پریشان ہو گئے، کہنے لگے یہ ٹھیک نہیں لگتا۔ رپورٹ اپنے پاس رکھنے لگے، میں نے کہا کہ ابھی اس پر کچھ کام رہتا ہے، میں جلد ہی آپ کو بھجوا دوں گا۔ 13 جون کو میں نے انکوائری کی ابتدائی رپورٹ، سرکاری طور پر، وزیراعظم صاحب کے دفتر بھجوا دی اور صدر صاحب کے لیے اس کی کاپی جنرل حامد کو۔ میں نے منسلک خط میں، جس پر میرے دستخط تھے۔ لکھا کہ ابتدائی انکوائری میں 81 ارب روپے سے زائد کی مالیاتی خورد برد کا انکشاف ہوا ہے۔ لکھا کہ کوئی مناسب تاریخ طے کر لی جائے، تاکہ متعلقہ شخصیات بیلڈ کر NAB کی اس رپورٹ پر غور کر سکیں اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اور یہ کہ موزوں ہوگا کہ اس میٹنگ سے پہلے، انکوائری کے انکشافات پر وزارت پٹرولیم کے جوابات بھی لے لیے جائیں، تاکہ معنی خیز مشاورت ہو سکے۔ (جاری ہے)

وزارت پیٹرولیم میں گھپلوں کو دبائے کیلئے دباؤ بڑھ گیا

نیب کی تحقیقات میں وزارت کے افسران الزامات کا جواب نہ دے سکے تو رپورٹ وزیراعظم کو بھیجوا دی۔ انہوں نے اپنے مشیروں ڈاکٹر سلمان اور مختار احمد کے ذریعے کرپشن سے پاک رپورٹ بنوائی۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا

تیل انکوائری کی ابتدائی رپورٹ ملتے ہی جنرل حامد جاوید نے مجھے اپنے دفتر بلا لیا۔ بہت ناراض تھے۔ کہنے لگے ”آپ نے تو اس کو آفیشل (official) بنا دیا، خط لکھ دیا۔ مجھے ویسے ہی انکوائری دے دیتے“۔ میں نے کہا ”میں کوئی ذاتی کام تو نہیں کر رہا، آفیشل کام ہے، آفیشل طریقے سے ہی کروں گا“۔ پریشانی میں کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ کہنے لگے ”اب اس کی سب کو خبر ہو جائے گی، یہ آپ نے کیا کیا؟“۔ میں نے ان سے کہا نہیں کہ آپ سب کے سب جو مل کر اسے دبائے کی کوششیں کر رہے ہیں، اسی لیے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ پھر میں نے ان سے کہا ”آپ اس میں کیوں پڑتے ہیں اور صدر صاحب کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں۔ حکومت کا کام ہے، وزیراعظم کو کرنے دیں۔ میں نے اسی لیے خط وزیراعظم صاحب کو لکھا ہے۔ آپ کو صرف اطلاع کیلئے کاپی بھیجوائی ہے“۔ پھر ان کا تجسس دیکھتے ہوئے کہا کہ ایک میٹنگ رکھوائی ہے جس میں NAB کی انکوائری ٹیم اپنی ابتدائی انکوائری کے انکشافات پیش کرے گی، اس میں حکومت کے تمام متعلقہ افسران بھی شامل ہوں گے، تاکہ میں ان کا نکتہ نظر بذات خود سن لوں۔ تجویز دی کہ اگر آپ

مناسب سمجھیں تو کوئی سے بھی ماہرین بھیج دیں، تاکہ ان کی رائے بھی سن لوں اور منصفانہ طور پر کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

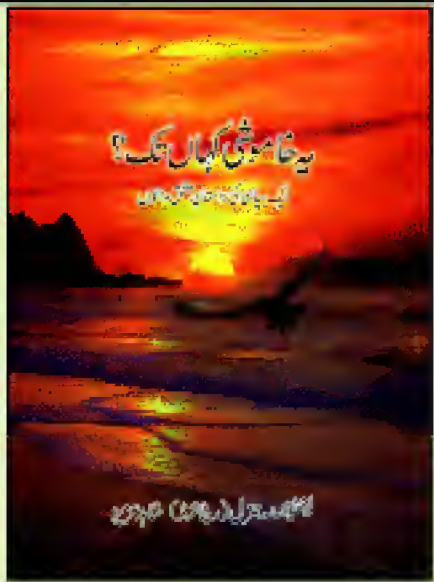
سپریم کورٹ میں بھی اس سلسلے میں مولوی اقبال حیدر، انجینئر اقبال ظفر جھگڑا اور سینیٹر رخسانہ زبیری نے حکومت کی مخالف رٹ دائر کی تھی (Constitution Petition 32, 33, 34/2005)۔ کورٹ نے NAB کو 22 جون کی تاریخ دی کہ اگر آپ کی رپورٹ تیار ہے، تو کورٹ میں پیش کریں۔ مجھے صدر کے دفتر سے منع کیا گیا کہ یہ رپورٹ ابھی نہیں دینی۔ رپورٹ ویسے بھی ابھی حکومت کے زیر غور تھی۔ میں نے کورٹ کو یہی جواب دیا کہ ہماری رپورٹ پر ابھی حکومت غور کر رہی ہے اور ہمیں ان کے فیصلے کا انتظار ہے۔ جب انکوائری پر آخری میٹنگ کی تاریخ طے ہو گئی، تو میں نے جنرل حامد صاحب کو دوبارہ فون پر کہا کہ کسی غیر جانبدار تیل کے کاروبار کو سمجھنے والے شخص کو بھیج دیں، تاکہ ہماری میٹنگ میں بیٹھ سکے، مگر انہوں نے کہا کہ آپ لوگ خود دیکھ لیں، ہم بعد میں دیکھیں گے۔ میں ”بعد میں دیکھیں گے“ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ وزیراعظم صاحب نے بھی کسی ایکسپٹ کو بھیجنے سے معذرت کر لی۔ 4 جولائی کو یہ میٹنگ رکھی گئی۔ اس میں پیٹرولیم اور وزارت خزانہ کے تمام متعلقہ افسران آئے۔ NAB کی انکوائری بہت تفصیل سے کی گئی تھی۔ کسی الزام کا وزارت پیٹرولیم کے افسران کے پاس کوئی مناسب جواب نہیں تھا۔ پھر انکوائری کو حتمی شکل دے کر وزیراعظم صاحب کو بھیجوا دی، ان سے ملنے بھی گیا۔ کہنے لگے، آپ لوگوں کو اس معاملے کی اتنی سمجھ نہیں ہے، کچھ ماہرین سے اس انکوائری کا تجزیہ کروا لیتے ہیں۔ میں نے کہا ضرور۔ کہنے لگے ”میں اپنے مشیر برائے مالیاتی امور (Advisor to PM on Finance and Economic Affairs) ڈاکٹر سلمان شاہ صاحب اور مشیر برائے توانائی مختار احمد صاحب سے کہوں گا کہ وہ اس انکوائری کو دیکھ لیں۔ وہ آپ سے بھی آکر ملیں گے، تاکہ آپ کا نکتہ نظر جانچ سکیں۔“

واپس دفتر پہنچا، تو کچھ دیر بعد وزیراعظم صاحب کا فون آیا۔ شاید وہ اب تک اپنے مشیروں سے مل چکے تھے۔ کہنے لگے ”ایک بات کہنی رہ گئی تھی، وہ یہ کہ ان ماہرین کا جو بھی فیصلہ ہوگا، وہ حتمی سمجھا جائے گا، کیونکہ یہ لوگ ان پیچیدہ چیزوں کو آپ سے اور مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ بہت الجھا ہوا سلسلہ ہے، عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہے۔ اگر ماہرین سمجھتے ہیں کہ انکوائری میں کچھ نہیں ہے، تو کیس ختم کر دیا جائے گا“۔ میں نے کہا ”اگر ان کی بات میری سمجھ میں آگئی اور مجھے تسلی ہوگئی، تو یقیناً کیس ختم ہو جائے گا“۔ کہنے لگے ”جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے یہ کیس ختم ہو جائے گا“۔ میں نے کہا ”حکومت پاکستان تو جب چاہے یہ کیس ختم کر سکتی ہے، لیکن جہاں تک NAB کا تعلق ہے، یہ کیس تب بند ہوگا جب چیئر مین NAB یہ سمجھے گا کہ کیس بند ہونا چاہئے“۔ کہنے لگے ”جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا“۔ میں نے کہا ”سرا! آپ وزیراعظم ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو وقت سے پہلے پتا ہو کہ آگے کیا ہونے والا ہے“۔ کہنے لگے ”دیکھیں گے“۔ بات ختم ہوگئی۔

ماہرین کی یہ ٹیم مجھے ملنے نہ آئی۔ 23 اگست کو وزیراعظم کے دفتر سے خط آیا۔ لکھا تھا، NAB کی رپورٹ کا دونوں مشیروں نے جائزہ لیا ہے۔ ان کا تجزیہ خط کے ساتھ منسلک ہے۔ 24 اگست کو وزیراعظم کے دفتر میں آپ کی رپورٹ اور اس تجزیے پر میٹنگ ہے۔ تجزیے کا نچوڑ یہ تھا کہ کوئی کرپشن نہیں ہوئی۔ کچھ غلطیاں ہوئی ہیں جو درست کر لی جائیں گی۔ لکھا تھا کہ NAB میں اس کام کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میں دیے ہوئے وقت پر وزیراعظم کے دفتر پہنچ گیا، مشیر نہیں آئے۔ وزیراعظم نے کہا اب اس معاملے کو جانے دیں، اس میں کچھ نہیں ہے۔ بہر حال آپ اپنی تسلی کیلئے مشیروں سے مل لیجئے گا۔ میں نے کہا کہ مشیروں نے تو مجھ سے ملے بغیر ہی رپورٹ بنائی، تو کہا کہ اب مل لیں۔ 28 ستمبر کو مشیروں سے ملاقات ہو سکی۔ میں اور عباس رضا صاحب ان کے دفتر گئے۔ ان کے پاس NAB کی ہر بات کا سطحی سا جواب تھا، بالکل وہی جواب جو وزارت پیٹرولیم دیتی تھی اور کسی منطق کو سننے پر آمادہ نہیں تھے۔ کہتے تھے دنیا میں تیل کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے، حالانکہ انکوائری میں تیل کی قیمت خرید وہی دکھائی گئی تھی جو اس وقت تھی۔ مگر وہ صرف جھوٹے اور بے بنیاد جواز بیان کرتے رہے۔ میں میٹنگ کے بیچ سے اٹھ کر چلا آیا۔ وزیراعظم چونکہ ہر صورت اس انکوائری کو ختم کرانا چاہتا تھا، میرے پاس اب اور کوئی چارہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ معاملے کو صدر صاحب کی طرف موڑ دوں۔ (جاری ہے)

بُنی سے مل جانے کا الزام جنرل حامد نے لگایا تھا

انہوں نے جنرل مشرف کو تیل انکوائری رپورٹ پر نوٹ لکھ بھیجا ”یہ وہی الزامات ہیں جو پی پی کی رخسانہ زبیری نے عدالت میں لگائے ہیں“۔ مشرف غیر جانبدار ماہر مقرر کرنے پر تیار ہو گئے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن الیون (9/11) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے اس مصرعے کی عملی تفسیر رہا: جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ☆

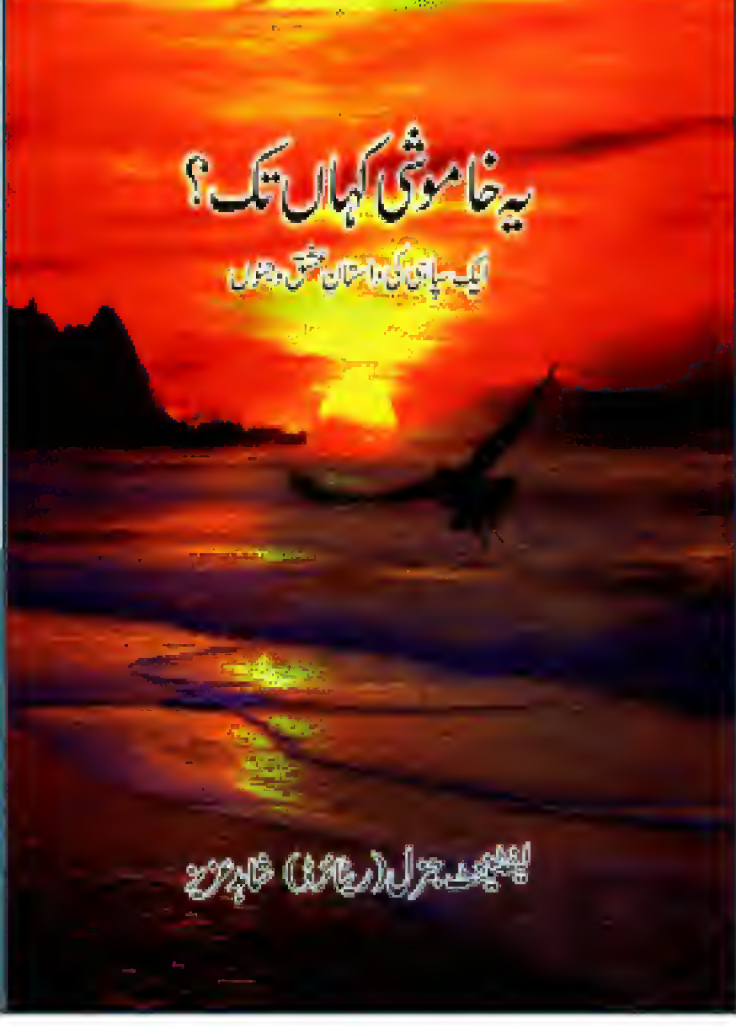
اگلے دن جنرل پرویز مشرف کو خط کے ذریعے تمام معاملات سے آگاہ کیا۔ خط میں لکھا کہ وزیر اعظم صاحب نے اس سلسلے میں اپنے مشیروں کی ایک کمیٹی بنائی تھی، جس نے NAB سے مشاورت کے بغیر اپنی ایک طرفہ رپورٹ بنائی، اور وہی نکتہ نظر پیش کیا ہے جو وزارت پیٹرولیم دے رہی ہے۔ NAB کی انکوائری میں لگائے کسی الزام کا براہ راست جواب نہیں دیا، اور نہ ہی کسی الزام کو رد کیا ہے۔ بنیادی طور پر کمیٹی کا یہ کہنا ہے کہ NAB حکومت کی پالیسی پر اعتراض کر رہا ہے، جو اس کا اختیار نہیں۔ میں نے لکھا کہ یہ سراسر غلط تاثر ہے اور اس لیے دیا جا رہا ہے کہ انکوائری کو مشتبه بنایا جائے۔ کمیٹی کی رپورٹ میں چوری کے تمام الزامات کو تیل کی خرید و فروخت اور قیمتیں متعین کرنے کے نظام کی پیچیدگیوں اور حکومت کے کام میں چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی آڑ میں چھپایا گیا ہے۔ کچھ چیزوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اب وزارت نے وہ غلطیاں درست کر لی ہیں، مثلاً General Sales Tax (GST) کا نفاذ۔ مگر اس مد میں جو 18 ارب روپے سے اوپر کا خسارہ حکومت کو ہوا۔ وہ کہاں سے پورا ہو گا؟ لکھا کہ کمیٹی کا کہنا ہے کہ اس نظام میں یقیناً کمزوریاں رہی ہیں لیکن یہ چیزیں وزارت خود ہی ٹھیک کر لے گی، اس میں NAB کو دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ جنہیں غلطیاں کہا جا رہا ہے ان سے اربوں روپے کا خسارہ ہوا ہے، یہ غلطیاں نہیں بلکہ بڑے پیمانے پر خورد برد ہے۔ لکھا کہ رپورٹ کہتی ہے کہ NAB اس لائق نہیں کہ اس پیچیدہ مسئلے کو سمجھ سکے، تو اگر NAB کی کارکردگی پر اعتقاد نہیں، تو انکوائری کو مزید آگے بڑھا کر اختتام تک پہنچانے کیلئے کوئی سے بھی تجربہ کار ماہرین مارکیٹ سے لیے جاسکتے ہیں، تاکہ اس خورد برد سے مستفید ہونے والے حضرات کو انجام تک پہنچایا جاسکے۔

جب یہ خط جنرل حامد کو ملا تو کچھ دنوں بعد انہوں نے مجھے دفتر بلا لیا۔ ان ہی دنوں مجھے خبر ملی تھی کہ صدر صاحب کو یہ بتایا گیا ہے کہ میں، پیپلز پارٹی والوں کے ساتھ مل کر، جن کی سینئر رخسانہ زبیری نے سپریم کورٹ میں حکومت کی خلاف ورسی کی ہوئی تھی، حکومت کو بدنام کرنا چاہتا ہوں، اور یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے جنرل مشرف نے فوج میں ترقی نہیں دی۔ دوسری مرتبہ یہ الزام مجھ پر لگایا گیا تھا اور دونوں مرتبہ چونکہ مشرف صاحب مجھے دباؤ میں لانا چاہتے تھے، انہوں نے اس الزام کو قبول کیا۔ ان کے کھیل میں فٹ ہوتا تھا۔ یہ تسلیم کر لینے سے کہ میں اصولی بات کر رہا ہوں، ان کے کردار پر آج آتی تھی۔ خیر، میں حامد صاحب کے دفتر پہنچا تو کہنے لگے کہ صدر صاحب نے بلایا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میرے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ میں پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر اس انکوائری سے جنرل مشرف کی حکومت کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟ فائلوں کے کاغذ منٹو لٹے ہوئے کہنے لگے ”یہ اسلام آباد ہے، یہاں ہر قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ تم ان پر دھیان نہ دیا کرو“۔ میں نے کہا ”میں اسلام آباد کی بات نہیں کر رہا“۔ پھر ان کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے کہا ”میں آپ کی بات کر رہا ہوں“۔ کہنے لگے ”تم خواخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے“۔ پھر ہم صدر صاحب کے دفتر کی طرف چلے گئے۔ یہاں صدر صاحب سے وہی بدتمیزی ملاقات ہوئی، جس کا ذکر پہلے کیا تھا۔ ان کی میز پر جو NAB کی انکوائری رپورٹ پڑی تھی، جسے انہوں نے بڑی غوث سے پرے دکھایا تھا، اس پر جنرل حامد صاحب کا نوٹ لکھا تھا کہ یہ وہی الزامات ہیں جو پیپلز پارٹی کی رخسانہ زبیری صاحبہ نے سپریم کورٹ میں لگائے ہیں۔ شوکت عزیز صاحب سے آخری ملاقات جب ہوئی تو کہنے لگے کہ آپ تیل کی انکوائری بند کر دیں اس سے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ شاید یہ خبر مل چکی تھی کہ مشرف صاحب مجھ سے بہت ناراض ہیں، اس لیے یہ بھی طیش میں تھے۔ میرے چہرے کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے کہنے لگے ”میں آپ کو یقین سے کہہ رہا ہوں کہ اس میں کوئی کرپشن نہیں ہے“۔ میں نے بھی اسی طرح ان کے چہرے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا ”میں بھی آپ کو یقین سے کہہ رہا ہوں کہ اس انکوائری کو انجام تک پہنچا کر رہوں گا“ اور اٹھ کر ان کے دفتر سے باہر آ گیا۔ اس کے بعد بس ایک مرتبہ انٹرنی کرپشن ڈے پر آنا سامنا ہوا تھا، جہاں وہ چیف گیسٹ تھے اور اپنی تقریر میں NAB کو خوب برا بھلا کہا۔ مگر شاید یہ ہنگام اس کام کو کرنے کی قیمت تھی۔ کافی دنوں تک خاموشی رہی۔ پھر کچھ لوگ، جو مجھے اور جنرل مشرف دونوں کو جانتے تھے، صلح صفائی کی کوششیں کرتے رہے، کہ یہ معاملہ کسی طرح موزوں انجام کو پہنچ جائے۔ ان کی مداخلت سے، ایک شام میری اور صدر صاحب کی ملاقات پریذیڈنٹ ہاؤس کے رہائشی حصے میں ہوئی۔ بہت اچھے ماحول میں بات ہوئی۔ جنرل مشرف نے پوچھا ”تم کیا چاہتے ہو؟“۔ میں نے کہا کہ اگر NAB کی انکوائری پر اعتبار نہیں، تو کسی غیر جانبدار ماہرین کی ٹیم سے اس انکوائری پر نظر ثانی کرائیں، وزیر اعظم کے مشیر تو غیر جانبدار نہیں۔ یہ بات ان کو پہلے بھی کہلوائی جا چکی تھی۔ اسی نوٹ پر یہ ملاقات ہوئی تھی۔ کہنے لگے ”ہاں، اگر تم چاہتے ہو تو ایسے کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر عشرت صاحب، جو اسٹیٹ بینک کے گورنر تھے، کیسے رہیں گے؟“۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا، تو کہا۔ ”وہ ان معاملات کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ پیسے کے کھیل بہت اچھے ہوئے ہوتے ہیں، یہ میری اور تمہاری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں عشرت صاحب کی نگرانی میں ایک ٹیم لگا دیتا ہوں، وہ دیکھ لیں گے“۔ میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہا کہ آپ کو جو بار بار یہ بتایا جاتا ہے کہ میں پر دموٹ نہ ہونے پر آپ سے خفا ہوں، اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دیں، ورنہ ہر بات پر آپ شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پر دموٹ کا خواہشمند ہوتا تو آپ پر یہ بات ظاہر ہوتی۔ میں نے انہیں وہ بھی بتایا جو میں نے اپنی پر دموٹ کے سلسلے میں ان کے سابقہ اسٹاف افسر جنرل ندیم تاج سے کہا تھا۔ انہوں نے بہت حیرانی سے اس بات کو سنا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ مجھے جو ہدایات دینی ہوں، وہ جنرل حامد کے ذریعے نہ دی جائیں، کیونکہ میں اب ان پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ کہنے لگے کہ اب آپ سے جو بات بھی کرنی ہوگی طارق عزیز صاحب کے ذریعے سے ہی ہوگی۔ انہوں نے بعد میں کسی سے شکوہ بھی کیا کہ کیسا آدمی ہے، مجھ سے کہتا ہے کہ تمہارا چیف آف اسٹاف اعتبار کے لائق نہیں! خیر، ہماری ملاقات بہت اچھے نوٹ پر ختم ہوئی۔ انہوں نے مجھے کافی کے ساتھ سگار بھی پلایا، الوداع کرتے وقت گلے لگایا اور گال بھی چوما۔ آج مجھے یہ سب لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ کاش وہ شخص کچھ حوصلہ کرتا، سچ پر کھڑا رہتا تو ملک کی تقدیر بدل سکتا تھا۔ سب ہی اس کے ساتھ تھے۔

(جاری ہے)

کرپشن مافیا کو نیب کے ہر کام کی خبر پہنچاتی تھی

آئل کمپنیوں سے متعلق انکوائریز سے ڈاکٹر عشرت حسین نے اختلاف کرتے ہوئے انہیں پالیسی کے خلاف قرار دیا۔ کرپشن کے آگے حکمران بھی بے بس ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی مگر صرف نظام سے لڑتا رہا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



دوسرے دن مجھے جنرل ندیم تاج کا فون آیا۔ وہ ان دنوں PMA میں کمانڈنٹ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جنرل مشرف نے ان سے فون پر اس بات کی تصدیق چاہی، جو میں نے ان سے اپنی پروموشن کے سلسلے میں کہی تھی۔ کہنے لگے۔ ”میں نے ان کو بتا دیا کہ ایسی بات آپ نے کہی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات تو آپ کو ان دنوں ہی بتا دینی چاہئے تھی۔“ تو کہا کہ، یہ بتانا انہوں نے اس وقت مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شاید صدر صاحب سے اس وقت یہ کہہ کر مجھے یوں ترقی کے دائرے سے باہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

اسی دوران NAB کی ٹیموں نے ڈیزل کے دو ٹینکروں پر کراچی پورٹ میں دو مختلف دنوں میں چھاپہ مار کر ان سے سیپل حاصل کئے اور جب فوج کی لیبارٹری سے ٹیسٹ کروائے تو پتا چلا کہ جو گریڈ کاغذات پر لکھا تھا اس سے بہت خراب گریڈ کا ڈیزل تھا۔ شاید دو چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ فوج کی ٹیسٹنگ لیبارٹری سے خط موصول ہوا کہ ہماری پچھلی رپورٹ غلط تھی، ڈیزل ٹھیک تھا، نئی رپورٹ حاضر ہے۔

تیل کے کاروباریوں کے ہاتھ خاصے دور تک پھیلے ہوئے تھے، NAB کے ہر کام کی انہیں خبر ہو جاتی اور کرپشن مافیا حرکت میں آ جاتا۔ کسی کارروائی کا جواز نہ رہا۔ پھر دو اور لیبارٹریوں سے چیک کروایا، مگر انہوں نے بھی ڈیزل ٹھیک ہونے کی رپورٹ دی۔ پھر یہ سیکمیل جرمی بھجوائے گئے۔ میرے NAB میں رہتے ہوئے سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا۔ اور کئی اہم کیسوں پر تفصیلات جمع کرنے کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ ان میں OGDCL (Oil and Gas Development Corporation Ltd.) کے کئی ایشو تھے، پرائیویٹائزیشن کمیشن کے چند اہم کیس اور منزل ڈیولپمنٹ سے متعلق کچھ تفصیلات شامل تھیں۔ کئی اہم شخصیات کے بارے میں لوگوں نے کافی شواہد جمع کر کے مجھ تک پہنچائے۔ ان میں کچھ فوج کے افسران اور ان کے رشتہ دار بھی شامل تھے، جن کے خلاف ریٹائرمنٹ سے پہلے انکوائری نہیں کھولی جاسکتی تھی۔ اہم شواہد کی کاپیاں میں اپنے پاس رکھ لیتا کہ کہیں NAB میں گم نہ جائیں۔ نیشنل بینک کے بھی کئی مسائل زیر تفتیش تھے اور اس سلسلے میں بھی وزیراعظم صاحب پریشان تھے کہ بینکوں کا اکم اس طرح بند ہو جائے گا۔ اسٹاک ایکسچینج کے بارے میں خاص ہدایات دی گئی تھیں کہ ملک کی معیشت کو نہ جھنجھوڑیں، اسے ہاتھ نہ لگائیں۔

میں یہاں تیل کی انکوائری کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، مگر اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ تیل کی پاکستانی کمپنیوں کے منافع جات ایسے تھے کہ OGRA کے آنے کے بعد، 2004-05ء میں ایک آئل کمپنی کا منافع 4,332 فیصد بڑھ گیا تھا، نیشنل ریفرنسری کا منافع 3,578 فیصد بڑھا، پاک ریفرنسری کا منافع 717 فیصد بڑھا اور PARCO کے منافع میں 597 فیصد بہتری آئی۔ یہ اعداد و شمار وزارت کی اکتوبر 2005ء کی سرے میں دیئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تیل بیچنے والی کمپنیوں کے منافع میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ انکوائری چونکہ مکمل نہیں کرنے دی گئی، اس لیے یہ بات واضح نہ ہو سکی کہ حکومت کے کون کون سے کارندوں نے کتنا ناجائز فائدہ حاصل کیا۔

انکوائری کو دوبارہ دیکھنے کے لیے کوئی ٹیم تو نہیں لگائی گئی، صرف ڈاکٹر عشرت صاحب کو ہی ذمہ دے دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ مجھ سے ملنے بھی آئے۔ انہوں نے قریب دو ماہ لگا کر اس انکوائری کو دوبارہ دیکھا۔ 6 دسمبر 2006ء کو ہماری انکوائری پر ڈاکٹر عشرت صاحب کی رپورٹ صدر صاحب کے دفتر سے موصول ہوئی۔ ڈاکٹر عشرت صاحب نے NAB کے چند انکشافات سے اختلاف کیا اور بقایا کو کام کرنے والوں کو غلطیاں ظاہر کیا۔ پھر وزیراعظم کے مشیروں کی طرح، یہ رنگ دیا کہ NAB پالیسی میں جھانک رہا ہے۔ حالانکہ یہ سرے سے غلط تھا۔ انہوں نے آخر میں لکھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ تیل کمپنیوں کو جان بوجھ کر ناجائز منافع کمانے دیا گیا ہے۔ میں ان کی رپورٹ پڑھ کر حیران نہیں ہوا، مجھے یہی توقع تھی۔ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

ڈاکٹر عشرت صاحب کی رپورٹ کے ساتھ منسلک جنرل حامد صاحب کے خط میں لکھا تھا، ”آپ ہی کی منظوری سے ڈاکٹر عشرت حسین صاحب کو، جن کا بہت وسیع تجربہ ہے اور بین الاقوامی ساکھ رکھتے ہیں، آپ کی انکوائری اور وزیراعظم صاحب کے مشیروں کی رپورٹ کا تجزیہ کرنے کو کہا گیا تھا،“ خط کے آخر میں لکھا تھا، ”اب جب کہ مختلف سطحوں پر اس کی تفصیلی جانچ پڑتال مکمل ہو چکی ہے، NAB اپنا نتیجہ اخذ کر کے اپنی رپورٹ بنائے۔“ میں طارق عزیز صاحب سے جا کر ملا۔ وہ ان دنوں نیشنل سیکورٹی کونسل میں تھے۔ کہنے لگے کہ آپ کو ڈاکٹر عشرت صاحب کی رپورٹ پڑھ کر تسلی ہوگئی ہوگی، اب یہ کیس بند کر دیں۔ سپریم کورٹ کو بھی اپنا جواب بھجوا دیں۔ انہوں نے مجھے بیس صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ بھی دی، اور کہا کہ یہ وہ رپورٹ ہے جسے آپ اپنی آخری رپورٹ بنا کر NAB کی طرف سے جاری کر سکتے ہیں۔ یہی رپورٹ کورٹ کو بھی بھجوا دیں۔ رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ NAB کو تسلی ہے کہ اس سلسلے میں کوئی کرپشن نہیں ہوئی۔

میں نے طارق صاحب سے کہا، ”ڈاکٹر عشرت کو اس لئے تمام چیزوں کو دیکھنے کے لئے کہا گیا تھا کیونکہ، صدر صاحب کے مطابق، مجھے ان چیزوں کی سمجھ نہیں ہے۔ تو اگر میں ان معاملات کی سمجھ ہی نہیں رکھتا، تو مجھے ڈاکٹر صاحب کی رپورٹ بھلا کیا سمجھ آئے گی؟ اور بغیر سمجھے ہوئے میں کیسے کہہ دوں کہ کرپشن نہیں ہوئی؟ اس مسئلے کا یہی حل ہے کہ میری انکوائری رپورٹ بھی سپریم کورٹ کو دے دی جائے اور ڈاکٹر عشرت کا تجزیہ بھی۔ پھر اگر کورٹ کی سمجھ میں بات آگئی، تو وہ خود ہی اس کا فیصلہ کر لیں گے۔“ طارق صاحب نے مجھے کافی سمجھانے کی کوشش کی، مگر میں بات یہیں چھوڑ کر آ گیا۔

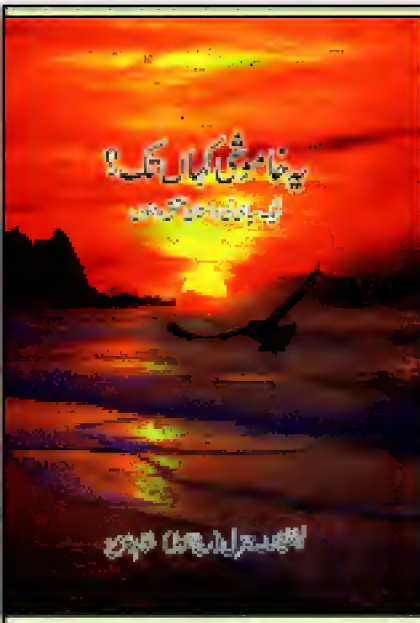
اخباروں میں تیل کی بیرونی کمپنیوں کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اگر NAB نے تیل کے بارے میں انکوائری بند نہ کی تو وہ پاکستان میں اپنا کاروبار بند کر دیں گی۔ انکوائری کسی کمپنی کے خلاف تو ہو نہیں رہی تھی، صرف حکومت کے افسران کی کارکردگی زیر تفتیش تھی۔ مگر ان ہی سے یہ کمپنیاں ناجائز منافع کمانی تھیں۔ اب ان کی امداد میں آکھڑی ہوئیں، پھر ان کا اپنا بھی ایسا منافع بند ہونے کا خدشہ تھا۔ اس دھمکی پر خاصی پریشانی کا اظہار کیا گیا کہ عوام کے لئے دشواریاں پیدا کی جا رہی ہیں، ملک کی معیشت تباہ کی جا رہی ہے۔ کچھ دن مجھ پر یوں ہی دباؤ پڑتا رہا کہ اب بہت ہو چکا، اس معاملے کو ختم کرو۔ میں نے طارق عزیز صاحب سے کہا کہ پھر یہ سارا مسئلہ ایگزیکٹو بورڈ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ ایگزیکٹو بورڈ کیا ہوتا ہے؟ جب میں نے تفصیلات بتائیں، تو کہنے لگے یہ بات کو پھیلانا ہوا، سب کو تمام تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ پھر پوچھا کہ، آپ کو آخر ایگزیکٹو بورڈ بنا کر اپنے ہاتھ باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے کہا کہ NAB کے قوانین کے مطابق میرا ذمہ ہے کہ کرپشن کی روک تھام کے لئے جو بھی مناسب سمجھتا ہوں، وہ اقدام لوں۔ یہ اس ہی سلسلے میں بنایا ہے کہ اس ادارے کے اندر بھی ہیر پھیر کی گنجائش ختم ہو، شفاف طریقے پر کام ہو۔ یہ ادارہ اعتبار کے لائق بنے۔ بات ابھی یہیں پھر رہی تھی کہ چیف جسٹس صاحب کے ساتھ حکومت کے مسائل ابھرنے لگے، پھر بے نظیر صاحبہ کے مقدمات اہمیت لے گئے اور مجھے NAB چھوڑنا پڑا۔

وقت گزرنے کے کافی عرصے بعد میرے علم میں آیا کہ 23 دسمبر کو سپریم کورٹ نے احکام جاری کئے تھے کہ 12 دسمبر کو اس کی میزنگ (سماعت) ہوئی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ”حکومت کی طرف سے کسی جامع جواب کے بغیر اس کیس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔“ اور اگلی میزنگ کی تاریخ 16 جنوری کی دی گئی۔ یہ احکام حکومت کے علاوہ، چیئرمین OGRA، آئل کمپنیوں کی ایڈوائسری کمیٹی OCAC اور تیل کی کمپنیوں کے مالکان کو بھیجے گئے۔ NAB کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ حکومت کی طرف سے ایک جامع جواب کورٹ میں جمع کروایا گیا تھا، جو یقیناً کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔

NAB سے فراغت کے کافی عرصے بعد، جسٹس رانا بھگوان داس صاحب کی سربراہی میں ایک جوڈیشل کمیشن قائم کیا گیا، جس نے مجھے 3 جون 2009ء کو بلایا۔ تیل کی وزارت اور OGRA کے افسران کو بھی۔ میں نے انہیں بھی ساری تفصیلات بتائیں۔ پھر نہ جانے اس سلسلے کا کیا بنا۔ اس تمام کھیل پر کیا تبصرہ کروں۔ کرپشن نے ہمارے نظام میں ایسے خچے گاڑے ہیں کہ، حکمران بھی بے بس ہیں۔ اگر وہ کرپشن کو نظر انداز نہ کریں تو حکومت گر جائے گی، یا حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نظام میں کرپشن کے خلاف جیتنا تو دور کی بات، جنگ ہی نہیں لڑی جاسکتی۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر صرف نظام سے ہی لڑتا رہا۔ جب تک یہ نظام نہیں بدلے گا، کچھ نہیں بدلے گا۔ اس نظام کی موجودگی میں۔ ملک سے کرپشن نہیں مٹائی جاسکتی۔

مشرّف نے نیب کی نگرانی کے لئے دوافسر مقرر کر دیے

حاضر سروس افسران محمد صدیق اور حسن وسیم افضل کو ڈپٹی چیئر مین بنا کر بھیجا گیا۔ بینظیر بھٹو کی خلاف کیسز بند کرنے کیلئے دباؤ بڑھ گیا۔ فائلیں مجھ سے لیکر وسیم افضل کو دیدی گئیں۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس



لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کا شمار افواج پاکستان کے مایہ ناز، بلند ہمت، باکردار اور اصول پسند افسران میں ہوتا ہے۔ انہیں جس قدر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین ہے۔ جہاں کہیں بھی وطن عزیز کے دفاع اور قومی مفادات کا معاملہ سامنے آیا، وہ حکمرانوں کے سامنے بڑی جرأت اور استقامت سے حاضر سروس جنرل ہوتے ہوئے بھی اختلافی رائے پیش کرتے رہے۔ ڈائریکٹر جنرل تجزیاتی ونگ کی حیثیت سے کارگل کے محاذ کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اعلیٰ فوجی حکام کو مہیا کیا۔ نائن ایون (11/9) کے بعد امریکہ کیلئے فوجی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے پر بھی اعلیٰ سطحی فوجی اجلاس میں کھل کر کلمہ حق بلند کیا۔ ان کی ملازمت کا عرصہ فیض کے مصرعے کی عملی تفسیر رہا:

جور کے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی اجازت سے، ان کی کتاب ”یہ خاموشی کہاں تک؟“ سے منتخب اقتباسات قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

”بینظیر بھٹو کی خلاف تمام کیسز بند کر دیے گئے ہیں۔ شاہد سے کہیں کہ اس کام کو مکمل کرنے کے طریقے اختیار کرے“۔ طارق عزیز صاحب نے مجھے جنرل مشرف کا حکم نامہ سنایا اور پوچھا کہ اب اسے کیسے کیا جائے؟ بہت دنوں سے یہ مسئلہ چل رہا تھا۔ میں ٹال مٹول کرتا رہا کہ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ شاید بے نظیر صاحبہ سے یہ سیاسی مذاکرات ناکام ہو جائیں۔ مگر اب سامنے دیوار کھڑی تھی۔ صدارتی حکم جاری ہو چکا تھا۔ میں نے کہا ”میرے پاس تو اور کوئی طریقہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں یہ عہدہ چھوڑ دوں، پھر آپ جیسے چاہیں ان کیسوں کو بند کریں“۔ مجھے کچھ سمجھانے لگے، مگر میں نے کہا یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اور اٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

میرے نیب میں آنے پر یہاں دو ڈپٹی چیئر مین لگا دیے گئے تھے۔ میجر جنرل محمد صدیق اور حسن وسیم افضل صاحب۔ حاضر سروس جنرل کو شاید اس لیے لگایا کہ میرے کام پر نظر رہے اور NAB ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ مجھ کو بتایا گیا کہ افضل صاحب کو خصوصی طور پر بے نظیر بھٹو صاحبہ اور ان کے خاندان کے افراد کے کیسوں کو دیکھنے کے لیے لگایا گیا ہے، تاکہ انہیں تیزی سے انجام تک پہنچایا جائے۔ نواز شریف صاحب کی حکومت میں بھی افضل

صاحب ہی بے نظیر صاحبہ کے کیسوں کے ذمہ دار تھے۔ ان کیسوں سے متعلق تمام فائلیں بھی افضل صاحب کو دے دی گئی تھیں اور مجھ سے جنرل حامد صاحب نے کہا کہ اس سلسلے میں، آپ اپنی تمام قانونی اتھارٹی بھی ان کے نام کر دیں، کہ یہی ان تمام کیسوں کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ بھی میں نے انہیں لکھ کر دے دیا تھا۔

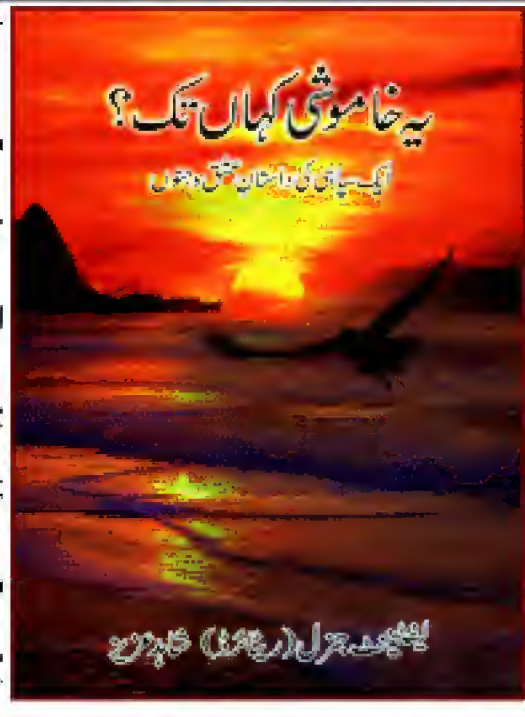
پہلے تو افضل صاحب نے شکایت کی کہ میرا دفتر ٹھیک نہیں ہے، پھر جنرل حامد سے کہلوا یا کہ انہیں ایک علیحدہ مقام پر دفتر رکھنے کی اجازت دی جائے۔ اسلام آباد میں ایک گھر کرائے پر لے لیا۔ میں پھر بھی ان کیسوں کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ پھر مجھے جنرل حامد نے کہا کہ ان کے کام میں مداخلت نہ کروں، میں نے کہا کہ میں چیئر مین ہوں، مداخلت کیسی ہے، مجھے پتا تو ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر انہوں نے جنرل حامد سے اجازت لی اور اپنا دفتر لاہور منتقل کر لیا۔ کچھ عرصے بعد مجھ سے کہا گیا کہ جو لوگ ان کے تحت کام کر رہے ہیں ان کی تنخواہیں بڑھادی جائیں۔ میں نے کہا کہ نیب میں دو قسم کی تنخواہیں تو نہیں دی جاسکتیں اور نہ ہی میرے پاس اتنا بجٹ ہے۔ پھر انہیں غیر رسمی بجٹ بھی ملنے لگا۔ 2007ء کے شروع میں طارق عزیز صاحب نے بتایا کہ برطانیہ اور امریکہ اس بات پر خاصا زور دے رہے ہیں کہ بے نظیر صاحبہ سے سمجھوتا کیا جائے اور انہیں واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ کہنے لگے کہ ان کے کیسوں کو شاید بند کرنا پڑے۔ ابھی کچھ مذاکرات چل رہے ہیں۔ میں نے اس سوچ سے اختلاف کیا، کہ یہ اس قوم سے بہت بڑی نا انصافی ہوگی کہ حکمرانوں کی لوٹ مار کے کیسز بند کئے جائیں۔ کہنے لگے بہت زیادہ دباؤ ہے، دیکھتے ہیں مذاکرات کیسے چلتے ہیں۔ مارچ کے شروع میں ان کے دفتر میں ایک ملاقات ہوئی، جس میں وسیم افضل صاحب اور انارنی جنرل محمد علی خان صاحب بھی موجود تھے۔ طارق عزیز صاحب نے بتایا کہ بے نظیر صاحبہ کو اسپین میں چلنے والے کیس پر زیادہ تشویش ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ اگر مذاکرات آگے بڑھانے ہیں تو اسے بند کیا جائے۔ میں ان کے کیسوں کے سلسلے میں 2006ء میں برطانیہ اور اسپین گیا تھا۔ اسپین کا کیس NAB نے نہیں کیا تھا۔ یہ اقوام متحدہ انکوائری کمیشن 2004ء کے فیصلے کے تحت دائر کیا گیا اور حکومت پاکستان اس میں 'Damaged Party' کے طور پر بعد میں شامل ہوئی۔ اس کے سارے شواہد بھی اقوام متحدہ نے ہی فراہم کئے تھے، جن کی انکوائری کے تحت بے نظیر صاحبہ پر الزام تھا کہ ان کی کمپنی نے، اقوام متحدہ کے Oil Food Program کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، صدام حسین صاحب کو دو بلین ڈالر کے کرٹیل کے ٹھیکے حاصل کئے۔ وسیم افضل صاحب اور میں، دونوں ہی اس کیس سے علیحدہ ہونے پر تیار نہیں تھے۔ طارق عزیز صاحب نے کہا کہ فی الحال ہم کیس ختم کرنا نہیں چاہ رہے، صرف کچھ ایسا کرنا چاہتے ہیں کہ بے نظیر صاحبہ ہم پر بھروسہ کر سکیں، تاکہ مذاکرات میں جان پڑے۔ کہنے لگے کہ اگر ہم اپنے اسپین کے انارنی کو تبدیل کریں، تو اس سے جو وقت ملے گا، اس عرصے میں ہم بات کو آگے بڑھا کر دیکھ سکتے ہیں۔ وسیم افضل صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن کہنے لگے کہ مجھے لکھ کر دے دیں۔ طارق عزیز صاحب نے میری طرف دیکھا، میں نے کہا کہ وسیم صاحب کو تو میں پہلے ہی ان تمام چیزوں پر قانونی طور پر مجاز بنا چکا ہوں، انہیں میری لکھی ہوئی ہدایات کی ضرورت نہیں۔ مگر وسیم صاحب شاید آئندہ ہونے والی کسی قانونی کارروائی کے خوف سے، لکھے ہوئے احکامات پر زور دے رہے تھے۔ طارق عزیز صاحب بھی کچھ لکھ کر دینے پر رضامند نہیں تھے۔ انارنی جنرل صاحب کا بھی خیال تھا کہ لکھ کر دینے میں شاید کسی قانونی کارروائی کا جواز بن سکتا ہو۔ پھر میں نے کہا لائیں میں لکھ کر دے دیتا ہوں، سو چاہیہ کرنا بھی چاہتے ہیں، ڈرتے بھی ہیں۔ جب کرنا ہے، تو ڈرنا کیا۔ ایک کاغذ پر کچھ لکھا، پڑھ کر سنایا تو انارنی جنرل صاحب نے کہا یہ نہ لکھیں۔ پھر انہوں نے مجھے لکھوایا، اور میں نے وسیم افضل صاحب کو لکھ کر دیا کہ جو پاور آف انارنی کورٹ میں ہماری نمائندگی کرنے کے لیے دی گئی ہے اسے واپس لے لیا جائے، اور لائزز کا ایک نیا بیٹل بنائیں، جن میں سے کسی کو چنا جاسکے، جو اس کیس میں حکومت پاکستان کی نمائندگی کرے۔ میں نے 7 مارچ کو یہ خط دستخط کر کے انہیں دے دیا۔ بات ختم ہو گئی۔ دل میں یہی دعا کرتا رہا کہ مذاکرات ناکام ہو جائیں۔ نیب کی کارروائیوں سے حکومت اب تک استرا چکی تھی۔ اب انکیشن کی بھی تیاریاں شروع کرنے کا وقت آ رہا تھا، جس میں NAB کے استعمال کا ارادہ نظر آتا تھا۔ ان دنوں مجھ سے حکومت نے ان سیاست دانوں کے نام مانگے جن کے خلاف تفتیش چل رہی تھی۔ میں نے نام دینے سے معذرت کر لی۔ میں جانتا تھا کہ یہ نام سیاسی سودے بازی کے لیے مانگے گئے ہیں۔ مجھ پر کافی دباؤ رہا۔ جب کہیں سے بات نہ بنی، تو ایک پارلیمنٹری کمیٹی سے مجھے سرکاری خط بھجوایا گیا کہ یہ نام پارلیمنٹ کو چاہئیں۔ میں نے لکھ کر جواب دیا کہ NAB نام دینے سے قاصر ہے۔ پھر مجھے اعلیٰ سطح پر سمجھایا گیا کہ تم فوجی ہو، پارلیمنٹ کی اتھارٹی کو شاید سمجھتے نہیں۔ تم اس کو انکار نہیں کر سکتے۔ کیوں اپنے لیے مشکل کھڑی کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہمارا آئین ہر شہری کی عزت کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کو سمجھنا چاہئے کہ میرے نام دینے سے آئین کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اگر میں حد سے تجاوز کر رہا ہوں تو مجھے کورٹ میں لے جائیں، اگر سپریم کورٹ کہے گا تو نام دے دوں گا۔ پھر بات ختم ہو گئی۔ (جاری ہے)

اصولی اختلافات پر نیب سے استعفیٰ دے دیا

مشرف کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ قانون میں ترمیم کر کے مجھے زبردستی نکال دیں۔ لیکن ایسا نہیں کیا۔ جس پر اعتبار کیا

وہ بھی اسی نظام کا حصہ بن گیا۔ کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز کی کتاب سے اقتباس

حکومت نے نیب کو کنٹرول کرنے کیلئے ایک زور آزمائی اور کی۔ مجھے کہا گیا کہ صدر صاحب نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ ایک کونسل بنے گی، جو نیب کے اہم کیسوں کو سنے گی۔ اس میں جنرل حامد، طارق عزیز، انارنی جنرل، میں اور نیب کے پراسیکیوٹر جنرل عرفان قادر بیٹھیں گے۔ قادر صاحب نہایت شائستہ طبیعت کے انسان تھے۔ اور ایک ان کے ڈپٹی تھے، ملک افضل، جنہوں نے سارے کام کا بوجھ اٹھایا ہوا تھا، اور بلا جھجک کام کرتے تھے۔ مجھے کہا گیا کہ جس کیس کی حکومت نشاندہی کرے گی، وہ اس کونسل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگر یہ کونسل سمجھے گی کہ کیس کو آگے بڑھانا ہے، تو ہی نیب اس پر کارروائی کا مجاز ہوگا، ورنہ کیس بند کر دیا جائے گا۔ میں نے کہا، کونسل کے سامنے کیس پیش کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں ان کے مشوروں سے مستفید ہوں گا، لیکن کیس صرف اس وقت بند کروں گا جب میں سمجھوں گا کہ یہ



کیس جائز نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ نیب کے قانون میں یہی لکھا ہے اور میں صرف اس قانون کے مطابق کام کرنے کا مجاز ہوں۔ اس کا تحفظ میری اخلاقی اور آئینی ذمہ داری ہے۔

اس موضوع پر کافی دن تک لے دے ہوتی رہی، پھر مجھ سے کہا گیا کہ میں صدر صاحب کو NAB کی طرف سے ایک خط لکھوں کہ ایک جوڈیشل کمیشن تشکیل دیا جائے جو NAB کی کارروائیوں کو دیکھ سکے۔ میں نے 30 مارچ 2007ء کو اس موضوع پر خط لکھ کر بھیج دیا۔ مگر مشورہ یہ دیا کہ چونکہ 2002ء کی اینٹی کرپشن اسٹریٹیجی نے پانچ برسوں میں کچھ حاصل نہیں کیا، تو ایک جوڈیشل کمیشن بنایا جائے جو اینٹی کرپشن کے ہر پہلو کا جائزہ لے اور ایک نئی اسٹریٹیجی بنائے اور ایسے ڈھانچے اور قوانین تشکیل دے جو اس اسٹریٹیجی کے مقاصد کو وقت مقررہ پر پورا کر سکیں۔ اس پر بھی خاصی ناراضگی رہی۔ پھر کچھ عرصے بعد خبر ملی کہ NAB کے قوانین کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ ان میں کیا ترامیم کی جائیں کہ چیز میں کو پوری طرح تاح کیا جاسکے۔

اپریل کے مہینے میں ایک دورے پر میں جنوبی افریقہ گیا، جہاں اینٹی کرپشن پر ایک بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ جب واپس آیا تو پتا چلا کہ میری غیر موجودگی میں ڈپٹی چیئر مین ویم افضل کا دفتر، جولاہور میں تھا، ختم کر دیا گیا ہے اور بے نظیر صاحبہ اور ان کی فیملی کے کیسوں کے تمام کاغذات NAB اسلام آباد کے دفتر بھجوائے جا چکے ہیں۔ اب ساری ذمہ داری کا طوق میرے گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔ طارق عزیز صاحب کو ملتا تو کہنے لگے کہ بی بی صاحبہ کا اسپین والا کیس بند کر دیں۔ میں نے جان چھڑانے کیلئے کہا کہ اگر آج میں کیس بند کر دوں، اور کل بے نظیر صاحبہ مجھ پر ایک کیس کھول دیں، کہ میں نے چیز میں NAB کی حیثیت سے ان پر جعلی کیس بنایا تھا اور ہتک عزت کا دعویٰ کر دیں، تو میں کہاں جاؤں گا؟ کہنے لگے نہیں نہیں، ان معاملات میں ایسے نہیں ہوتا۔ مگر میں اسی کی اوٹ لیتا رہا۔ پھر انہوں نے کہا کہ جو رقم بھی بھرنی پڑی حکومت بھرے گی، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ میں نے کہا میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔ کل حکومت بدل جائے تو پھر؟ کچھ دن اور یوں ہی گزر گئے۔ حکومت اور چیف جسٹس صاحب کے بیچ مسائل شروع ہو چکے تھے۔ لال مسجد کا مسئلہ بھی چل رہا تھا، بے نظیر صاحبہ کے کیسز کا معاملہ لٹکا رہا۔

پھر ایک دن طارق صاحب نے دفتر بلوایا۔ کہنے لگے ”ملک کا سیاسی استحکام داؤ پر لگا ہوا ہے، کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ دنیا سے ہمارے تعلقات کا انحصار بھی اب اسی پر ہے کہ بے نظیر صاحبہ کے تمام مقدمات بند کر دیئے جائیں“۔ کہا، آپ تو جانتے ہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کا اس سلسلے میں کتنا دباؤ ہے۔ میں نے کہا کہ میں ان تمام باتوں کو سمجھتا ہوں، مگر اس کام کو کرنے میں میرے لیے بہت پیچیدگیاں ہیں۔ کہنے لگے آپ لندن چلے جائیں، وہاں رحمن ملک صاحب سے مل لیں، وہی بے نظیر صاحبہ کے کاروبار کو سنبھالتے ہیں، اور آپ کو وہی یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ کا نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا یقین دلائیں گے؟ تو ہنس کر کہنے لگے، آپ ان سے ملیں تو سہی۔ کہنے لگے پھر اسپین بھی چلے جائیں، وہاں بے نظیر صاحبہ کے وکیل آپ کو دستاویزی یقین دہانی بھی کرا دیں گے، کہ آپ کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

ایک عرصے سے اس مسئلے کو ٹال رہا تھا مگر اب مزید ٹال منول کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ صاف کہنا پڑا کہ یہ مقدمات میں اصولی طور پر بند نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا یہ میری موجودگی میں نہیں ہوگا۔ وہ کچھ ناراض ہو گئے کہ مجھے پہلے ہی بتا دیتے، اتنے دنوں اس معاملے کو کیوں لٹکائے رکھا؟ میں واپس اپنے دفتر آ گیا۔ اگلے دن پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے وہ حکم نامہ سنایا جس کا ذکر شروع میں کیا ہے۔ صدر صاحب نے بے نظیر بھٹو کے مقدمات بند کر دیئے تو میں اب اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا، سوائے اس کے میں یہ عہدہ چھوڑ دیتا۔ طارق عزیز صاحب کو یہ کہہ کر کہ اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں، میں اپنے دفتر واپس آ گیا۔ دن گزرنے کو تھا کہ ان کا فون آیا۔ کہنے لگے، ہم نے اس موضوع پر ایک میٹنگ کی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ اس میٹنگ میں کون کون تھے۔ پھر کہا کہ ہم سب کا یہی خیال ہے کہ آپ یہاں سے نہ جائیں اور اس مسئلے کو کسی طرح حل کر لیں۔ میں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ تو کہا کہ پھر اپنا استعفیٰ بھجوادیں۔ کچھ دیر بعد دوبارہ فون آیا کہ آج کل چیف جسٹس صاحب کا مسئلہ بھی چل رہا ہے اور لال مسجد کا بھی، اگر آپ ان حالات میں استعفیٰ دیں گے تو حکومت کو خاصا دھچکا لگے گا۔ کہنے لگے آپ سے گزارش ہے کہ خرابی صحت کی بنیاد پر دو ماہ کی چھٹی لے لیں، پھر اگر چاہیں تو استعفیٰ دے دیں۔ میں نے کہا کہ حکومت کو غیر مستحکم کرنا میرا مقصد نہیں، میں ایسے ہی کر لیتا ہوں۔ کہنے لگے آپ اور بیگم صاحبہ دو ماہ کے لیے بیرون ملک جہاں بھی جانا چاہتے ہوں چلے جائیں اور طبی معائنے وغیرہ بھی جہاں سے چاہے کر لیں، تمام اخراجات ہم اٹھائیں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔

3 مئی 2007ء کا دن تھا۔ اسی دن دو ماہ کی میڈیکل بنیاد پر چھٹی کی درخواست وزیراعظم صاحب کو بھجوائی اور ڈپٹی چیئر مین میجر جنرل محمد صدیق کو چیئر مین کے طور پر کام کرنے کا مجاز نامہ دے کر گھر چلا گیا۔ پھر اس دن کے بعد دفتر نہیں گیا۔ چھٹیوں کے دوران مجھ پر لگاتار زور پڑتا رہا کہ اب آپ کی غیر حاضری میں مقدمات بند ہو چکے ہیں، آپ پر تو ان کا بوجھ نہیں ہے، تو آپ واپس آ سکتے ہیں۔ مجھے استعفیٰ دینے کی مجبوری نہیں تھی۔ اپنی جگہ پر ڈٹ بھی سکتا تھا، مشرف صاحب کو مجبور کرتا کہ وہ قانون میں ترمیم کر کے مجھے زبردستی نکال دیں، مگر ایسا کیا نہیں۔ اس کا شاید صرف ایک ہی فائدہ ہوتا کہ میں ہیرو بن جاتا۔ چیف جسٹس صاحب کے جلوس میں شامل ہو جاتا۔ گرتی ہوئی حکومت کو گرانے میں میرا بھی ہاتھ ہوتا۔ سیاسی روپ دھار لیتا۔ اوروں کی طرح چیزوں کو بدل دینے کا نعرہ میں بھی لگاتا۔ لیکن میرا دل اس طرف مائل نہیں تھا۔ اس کا فائدہ کوئی سیاست دان ہی اٹھاتا، جن میں سے کسی پر بھی میرا اعتقاد نہ تھا۔ کس کے ساتھ کھڑا ہوتا؟ جس کا اعتبار کیا تھا، جس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا، وہ بھی ان ہی سیاست دانوں کے ساتھ مل گیا تھا، اسی نظام کا حصہ بن گیا تھا۔